پدری سماج اور مسلم خواتین کی صورت حال

rafeeqemanzil.com
/rafeeqemanzil

نئی نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی

ماہنامہ

جلد: ۳۲ | شمارہ: ۸ | اگست ۲۰۱۹ء | ذوالقعدہ/ ذوالحجہ ۱۴۴۰ھ

editor@rafeeqemanzil.com

MANAGER
ABDUL JABBAR
managerrmgp@sio-india.org

Asst. MANAGER
Saleem Akram 08867255364
asst.managerrmgp@sio-india.org

₹15 | سالانہ ₹160

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Ph: 8447622919 | Email: officermgp@sio-india.org | www.rafeeqemanzil.com

Printed on behalf of The Students Islamic Organisation ofIndia, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor : Saud Firoz Ahmed**

خواتین کے ساتھ حسنِ سلوک

محمد اکمل فلاحی

زندگی ایک گاڑی کے مانند ہے۔ اور مرد وخواتین اس گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ مَردوں کے بغیر عورتوں کی زندگی اور عورتوں کے بغیر مَردوں کی زندگی ادھوری ہے۔ زندگی کی اس گاڑی کو اچھی طرح چلانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کیا جائے۔ ایک دوسرے کا ادب واحترام کیا جائے۔ ایک دوسرے کی عزت وخدمت کی جائے۔ ایک دوسرے کو خوش رکھا جائے۔ عورتوں کو کمزور سمجھ کر، حقیر سمجھ کر، کمتر سمجھ کر، ناقص العقل سمجھ کر، بے وقوف سمجھ کر اُن کے ساتھ بدسلوکی کا رویہ اپنانا سراسر غلط ہے۔ ہر خاتون تخلیقی اعتبار سے اپنی ذات میں مکمل ہے۔ محترم ہے۔ مکرم ہے۔ طاقتور ہے۔ عقلمند ہے۔ باا‌ثر ہے۔ باعزت ہے۔ ہر خاتون حسنِ سلوک کی پوری پوری مستحق ہے۔ عورتوں کے تعلق سے ہمیں اپنی غلط سوچ کو اچھی سوچ میں بدلنا ہوگا۔

ماں حسنِ سلوک کی مستحق ہے کیوں کہ اس نے آپ کو نَو ماہ تک پیٹ میں لے کر ڈھویا ہے۔ تکلیف پر تکلیف اٹھایا ہے۔ پیدائش کے بعد اپنے جسم کا خون نچوڑ کر دودھ کی شکل میں پلایا ہے۔ اپنا آرام حرام کر کے آپ کو آرام پہنچایا ہے۔ خود جاگ کر آپ کو چین کی نیند سلایا ہے۔ خود بھوکی رہ کر آپ کو کھانا کھلایا ہے۔ اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا اور بہت کچھ آپ کو سکھایا ہے۔ بڑے لاڈ و پیار سے پالا ہے۔ ماں سراپا رحمت ومودّت ہے۔ الفت ومحبت ہے۔ ماں سراپا خیر خواہی ہے۔ بڑے ہو کر ایسی پیاری ماں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا آپ پر فرض ہے۔ اگر آپ نے اس فرض کو ادا نہیں کیا تو آپ خدا کی نگاہ میں احسان فراموش اور ناشکرے قرار پائیں گے۔ ماں کو نہ ڈانٹیے، نہ جھڑکیے بلکہ جتنا ہو سکے اُن کا اچھی طرح خیال رکھیے۔ اُن کی دل سے خوب خوب خدمت کیجیے۔ انہیں ہر طرح کا آرام دیجیے۔ اُن پر اپنا مال خرچ کیجیے۔

بیوی حسنِ سلوک کی مستحق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیویوں کو شوہروں کے لیے سکون کا بہت بڑا ذریعہ بنایا ہے۔ بیویاں مَردوں کے عیب چھپانے اور ذلت ورسوائی سے بچانے کا بہترین لباس ہیں۔ بیویوں کے ساتھ حسنِ سلوک کر کے اپنے سکون کو غارت ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں اُن کا سکون اُن کی زندگی سے بہت جلد رخصت ہو جاتا ہے۔ اگر کبھی کسی وجہ سے کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے تو مل بیٹھ کر اس غلط فہمی کو فوراً دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بہترین شوہر وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے، اس کی ضروریاتِ زندگی کا بندوبست کرے۔ بیوی کو ستانا، اس کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا، بات بات پر جھڑکنا، طعنہ دینا، اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا منع ہے۔ بیوی ہماری بیوی ضرور ہے لیکن وہ کسی کی بیٹی بھی ہے۔

بیٹی حسنِ سلوک کی مستحق ہے کیونکہ بیٹی ہی کل ماں بنے گی، بہو بنے گی، اس کی کوکھ سے نئی نسل تیار ہوگی۔ بیٹی بوجھ نہیں خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ بیٹی کا بیٹے کی طرح میراث میں پورا پورا حق ہے۔ اس کا حق ادا کیا جائے۔ اس کی تعلیم وتربیت کا بہترین نظم کیا جائے۔ بیٹی کو گری ہوئی نگاہوں سے دیکھنا بہت بڑی نادانی اور غلطی ہے۔ بیٹی کو بھی اتنا ہی پیار ملنا چاہیے جتنا بیٹے کو ملتا ہے۔ بیٹی کے ساتھ حسنِ سلوک کے سارے دروازوں کو کھولنا ہماری ذمے داری ہے۔

بہو حسنِ سلوک کی مستحق ہے کیونکہ بہو بھی کسی کی بیٹی ہے۔ کسی کی بہن ہے۔ بہو کے ساتھ ساس کا رویہ عموماً بدسلوکی پر مبنی ہوتا ہے۔ کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کی بیٹی کے ساتھ اس کی سسرال والے برا سلوک کریں؟ کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کی بیٹی پر ظلم ہو؟ نہیں، کبھی نہیں۔ اس لیے آپ بھی دوسروں کی بیٹیوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آئیے۔

بہن حسنِ سلوک کی مستحق ہے کیونکہ بہن بھی بھائیوں کی طرح اپنے ماں باپ کی اولاد ہے۔ اچھے بھائیوں کی پہچان ہے کہ وہ اپنی بہنوں کے ساتھ پیار ومحبت، اپنائیت، نرمی سے پیش آتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا رویہ اپناتے ہیں۔ اسی طرح خالہ، پھوپھی، چچی، ممانی بھی حسنِ سلوک کی مستحق ہیں۔ اسی طرح خاندان، رشتے دار اور محلے پڑوس کی ہر خاتون حسنِ سلوک کی مستحق ہے۔

الغرض ہر خاتون کو ادب واحترام کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ عورت کو محض مردانہ ہوس کی تسکین کا سامان نہ سمجھا جائے بلکہ اس کی عزت نفس اور اس کی عزت وآبرو کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آیا جائے۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ اسلام کی تعلیمات پر عمل کر کے ہی ہم دنیا اور آخرت کی کامیابی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔

شرر

پدری سماج اور مسلم خواتین کی صورت حال

عورت اور مرد انسانی سماج کی بنیادی اکائی ہیں۔ یہ دونوں ہیں تو دو مستقل بالذات وجود لیکن ایک مکمل و متوازن سماج کی تعمیر کے لیے ہر سطح پر دونوں کا اشتراک عمل کچھ اس حد تک ناگزیر ہے کہ دونوں کو ایک مانے بغیر چارہ نہیں۔ اس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں در اصل ایک ہی وجود، انسانی وجود کے دو مختلف قالب ہیں جن میں سے ایک کی غیر موجودگی میں دوسرے کی تکمیل فطری طریقے سے ممکن نہیں ہے۔ یہ انسانی زندگی کی بنیادی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت ہے۔ اس اعتراف حقیقت کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ عورت اور مرد کی انسانی حیثیت میں سرِ مو امتیاز گوارہ نہ کیا جائے، دونوں کے یکساں حقوق اور یکساں فرائض تسلیم کیے جائیں، نہ عورت یہ خیال کرے کہ وہ 'اصل' ہے اور مرد کی حیثیت ثانوی ہے اور نہ مرد ہی یہ سمجھے کہ وہ 'اصل' ہے اور عورت کی حیثیت ثانوی ہے۔ دونوں ہی اصل ہیں اور انسانی تمدن میں دونوں کی حیثیت بنیادی و مرکزی ہے۔ زمان و مکان کی حدود سے پرے، انسانی تمدن کی ترقی اور اس کا نمو دبھی اسی حقیقت کے اعتراف پر موقوف ہے۔ جس نظام تمدن میں اس حقیقت کا جس قدر اعتراف کیا جائے گا اور اس اعتراف کے تقاضے جس قدر پورے کیے جائیں گے، وہ نظام تمدن اسی قدر خیر اور حسن سے معمور ہوگا۔ اس کے برخلاف جس نظام تمدن میں اس حقیقت کے اعتراف میں جس قدر کوتاہی کی جائے گی اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے میں جس قدر لاپرواہی برتی جائے گی وہ نظام تمدن اسی قدر شر اور فساد سے بھرتا چلا جائے گا۔

حیات انسانی کے اسرار و رموز اور اس کی بنیادی حقیقتوں کے مکمل ادراک، عرفان اور اعتراف کے لیے لازمی ہے کہ انسان کا رشتہ اس کے خالق حقیقی سے جڑا ہوا ہو۔ جب خدا سے یہ رشتہ استوار ہوتا ہے تو انسان ایک غیبی سرپرستی میں ادراک و عرفان کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔ جب یہ رشتہ کمزور یا منقطع ہوتا ہے تو انسان کی چشم بصیرت پر بھانت بھانت کے تعصب اور جہالت کے حجابات پڑ جاتے ہیں پھر انسان حقائق کے ادراک میں عملاً ناکام ہو رہتا ہے۔ انسانی تاریخ کا ایک بڑا عرصہ خدا اور اس کی ہدایت و رہنمائی سے بے توجہی، لاتعلقی اور بیزاری میں گزرا ہے۔ چنانچہ زندگی کے متعدد حقائق کے سلسلے میں انسان صحیح رائے قائم کرنے سے معذور رہا ہے۔ یہی معذوری عورت اور مرد کے صحیح مقام و مرتبہ کے تعین میں بھی نظر آتی ہے۔ عورت اور مرد کی جسمانی ساخت، صلاحیتیں اور مزاج فطری طور پر مختلف ضرور ہیں لیکن یہ اختلاف کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر عورت اور مرد کی انسانی حیثیت میں امتیاز پیدا کر دیا جائے۔ لیکن الٰہی ہدایات سے بے توجہی کا نتیجہ یہ رہا کہ ان ہی فطری اختلافات کو بنیاد بنا کر بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کا فائدہ اٹھا کر مذہبی، سیاسی اور معاشی اعتبار سے بااختیار مردوں کے ایک طبقہ نے اپنے آپ کو سماج میں مرکزی حیثیت دے دی اور عورت کی حیثیت کو ثانوی قرار دے کر تعمیر سماج میں اس کے کردار کو بڑی حد تک محدود کر دیا۔ اتنا محدود کہ عورت ایک مفلوج، محکوم و مظلوم وجود کا نام بن کر رہ گئی۔ امتداد زمانہ کے ساتھ عورت کی یہ ثانوی حیثیت اس کے سماجی اور معاشرتی استحصال کا عنوان بنتی چلی گئی۔

عورت کے استحصال کی تاریخ دنیا بھر میں بھی اور خود ہندوستان میں بھی صدیوں پر محیط ہے اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ اس استحصال کی راہ ہموار کرنے میں ایک تو عورت سے متعلق غیر آسمانی مذاہب کے تصورات نے، دوسرے، تحریف شدہ آسمانی مذاہب کے ماننے والے مَردوں کی خود ساختہ مذہبی روایات نے، تیسرے، سرمایہ داریت (Capitalism) بمعنی بازارواد نے اور چوتھے، خالص جذباتی ردعمل پر مبنی نسائیت کی انتہا پسند تحریکوں نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ مختلف مذاہب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ عورت کے حوالے سے ان کی تعلیمات تعصب پر مبنی رہی ہیں۔ کسی مذہب نے عورت کو 'ناگزیر برائی' قرار دیا تو کسی نے اسے تمام برائیوں کا سرچشمہ قرار دیا۔ کسی نے عورت کے وجود ہی کو باعث نحوست قرار دیا۔ تحریف شدہ آسمانی مذاہب میں ایسی روایات فروغ پا گئیں جن میں بتایا گیا کہ جنت میں حضرت آدمؑ کو اللہ کی نافرمانی پر (حضرت) حوا نے اکسایا تھا جس کی پاداش میں حضرت آدمؑ راندہ دربار ہوئے (نعوذ باللہ من ذلک) اور اس بناء پر حوا اور بنت حوا مرد کی ازلی بدخواہ اور دشمن قرار پائیں۔ خود اسلامی علمی تراث بھی پدری (Patriarchal) تعبیر و تشریح سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ قرآن و حدیث رسول میں وارد کئی نصوص کی ایسی تعبیر کی گئی جس کے نتیجے میں مسلمانوں میں عورت مخالف ذہنیت گھر کرتی گئی۔ مثال کے طور پر متعدد علماء و مفسرین نے سورہ نساء کی آیت ''وخلق منھا زوجھا'' کی تفسیر میں وہ اسرائیلی روایت قبول کر لی جس کے مطابق حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اور اس بناء پر یہ تصور عام ہو گیا کہ اس کا مقام و مرتبہ آدم سے کم تر ہے۔ سرمایہ داریت نے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مادی منافع خوری کی دھن میں عورت کو غیر حقیقی آزادی، مساوات اور جدیدیت کا جھانسہ دے کر کارخانوں اور بازار میں لا کھڑا کر دیا۔ مَردوں کے انڈر گارمنٹس سے لے کر شیونگ کریم تک بیچنے کے لیے اس کے جسم کا استعمال کیا۔ مذہب اور سرمایہ داریت کے استحصال سے چھٹکارا دلانے کا نعرہ لے کر نسائیت کی تحریکیں سامنے آئیں۔ چوں کہ ان تحریکوں کی پشت پر کوئی مضبوط نظریاتی طاقت موجود نہیں تھی اس لیے یہ تحریکیں بھی نہ صرف ناکام ہوئیں بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ وہ روپ دھار لیا جس نے عورتوں کو استحصال کے ایک بدنما گڑھے سے نکال کر استحصال کے ایک دوسرے بظاہر خوش نما گڑھے میں گرا دیا۔

مغرب میں خواتین کی صورت حال اور ان کے استحصال پر ہمارے یہاں گفتگو ہوتی رہی ہے اور آج بھی ہو رہی ہے حالانکہ کلچر کی عالمگیریت (گلوبلائزیشن) کے بعد مغرب و مشرق کی تقسیم عملاً بے معنی ہو چکی ہے۔ عورت کے کردار کے حوالے سے نظریاتی طور پر ہم مغرب پر ضرور طعن و تشنیع

کر سکتے ہیں لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ خود ہمارے یہاں بھی عورت اور اس کے حقوق کی ادائیگی کی صورت حال خوشگوار نہیں ہے۔ خواتین کے حقوق کی ادائیگی کے معاملے میں چند فیصد مسلمانوں کو مستثنیٰ ضرور کیا جا سکتا ہے لیکن مسلمانوں کا عمومی رویہ غافلانہ و مجرمانہ بلکہ توہین آمیز ہے۔ ہمارا نظریہ اسلام ہے اس لیے اس میں تو شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ ہمیں دنیا کے تمام نظریات پر ایک گونہ تفوق حاصل ہے۔ تاہم جہاں تک خواتین کے حوالے سے اسلامی نظریہ کو روبہ عمل لانے اور خواتین کے حقوق ادا کرنے کی بات ہے، ہمارا رویہ انتہائی شرمناک ہے۔

خواتین کا کسی نہ کسی درجہ میں استحصال صدیوں سے جاری ہے۔ الغرض انسانوں کا اجتماعی ماحول صدیوں سے ہی عورت مخالف رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں آج ایک پدری سماج (Patriarchal Society) اور ایک پدری ذہنیت (Patriarcal Mindset) وجود میں آ گئی ہے۔ ہر مذہب کے ماننے والے اور ہر نظریہ کے علم بردار مرد، عورت کے تئیں مختلف تعصّبات (Prejudices) کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ تعصّبات کچھ اس طور پر مَردوں کے تحت الشعور کا حصہ بن چکے ہیں کہ اب انہیں تعصب مانا بھی نہیں جاتا۔ خود مسلم طرز معاشرت میں ان تعصّبات کے بے شمار مظاہر نوٹ کیے جا سکتے ہیں۔ مسلمانوں کا اکثریتی طبقہ آج بھی یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں اصل حیثیت مرد کی ہے جب کہ عورت کی حیثیت ثانوی ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ عورت کی تخلیق اس لیے ہوئی ہے کہ وہ مرد کی خدمت کرے۔ اس کی سوچ یہ ہے کہ عورت جنسی ہیجان کی تسکین کا سامانِ محض (Sex Commodity) ہے۔ کتنے گھرانے ایسے ہیں جو آج بھی لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے حق میں نہیں ہیں۔ کتنے گھرانوں میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ لڑکی اگر کالج یا یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے تو لازماً اس کا اخلاق خراب ہوگا۔ میراث میں بہنوں کا حق ہڑپ لینا عام دستور ہو گیا ہے۔ بہنیں بھی اس وجہ سے اپنے شرعی حق سے خود ہی دستبردار ہو جاتی ہیں کہ اگر انہوں نے اپنے حق کا تقاضہ کیا تو بھائیوں کی ناراضگی مول لینی پڑے گی اور بالآخر بھائی اپنے تعلقات منقطع کر لیں گے۔ رشتے طے کرنے کے دوران جس طرح منڈی میں جانور دیکھے جاتے ہیں پھر پسند آنے یا نہ آنے کی بنیاد پر جانوروں کو خرید لیا یا مسترد کر دیا جاتا ہے، اسی طرح مرد کو حق ہے کہ وہ لڑکی کو دیکھنے جائے، پسند آئے تو خرید لے ورنہ رد کر دے! البتہ اگر کوئی لڑکی یہ طے کرے کہ رشتہ طے ہونے سے پہلے وہ لڑکے کو اس کے گھر جا کر دیکھے گی، تو اسے اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ نکاح کے بعد عورت کی معاشی سرگرمی کا فیصلہ صرف شوہر کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اگر وہ اجازت دے تو ٹھیک ہے ورنہ عورت گھر میں بیٹھ کر شوہر کی آمدنی پر منحصر رہے۔ اسے خود فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ پہلے تو معاشی طور پر عورت کو عدم تحفظ کا شکار کر دیا جاتا ہے پھر اس کی اس مجبوری کا فائدہ اٹھا کر اس کے مزید استحصال کی راہ ہموار کی جاتی ہے۔ شوہر کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ چاہے جو بھی رویہ اختیار کرے، معاشی طور پر منحصر (Dependent) عورت اپنے شوہر کے ساتھ ہی رہنے پر مجبور ہوگی۔ یک بارگی تین طلاق پر ہمیشہ بحث ہوتی رہی ہے۔ علماء و مفتیان اس کے جواز میں فقہی دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں۔ درآں حالیکہ ہر وہ شخص جو فقہی عبارات کا حافظ محض نہیں ہے بلکہ اپنے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل بھی رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ ایک نشست میں تین طلاق کا رائج طریقہ عورت پر بدترین ظلم ہے۔ وہ عورتیں جن کے معاشی امکانات پر ان کے شوہر پہلے ہی قدغن لگا چکے ہیں اور جو اپنے حق خلع سے بھی ناواقف ہوتی ہیں، ان کے شوہر طلاق کو اور دوسری شادی کو ایک دھمکی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ خوبصورتی کا جو غیر انسانی تصور بالی ووڈ اور اس قسم کے دوسرے اداروں نے پیش کیا ہے اس سے مرعوب ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم نوجوان معمولی وجوہات کی بناء پر لڑکیوں کو رجیکٹ کر رہے ہیں یا شادی کے بعد طلاق دے رہے ہیں۔ ہزاروں نوجوان لڑکیاں ایسی ہیں جن کی عمر نکلتی جا رہی ہے لیکن ان کے لیے مناسب رشتہ کا بندوبست نہیں ہو پا رہا ہے۔ ہمارے پدری سماج میں مطلقہ ہونا بھی لڑکیوں کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں ہے۔ لغو اسباب کی بناء پر لڑکیوں کا طلاق ہو جاتا ہے پھر پوری زندگی انہیں تجرد کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ نوجوان لڑکوں کی بے جا مثالیت پسندی (Idealism) نے مطلقہ لڑکیوں کے نکاح ثانی کے امکانات ختم کر دیے ہیں۔ گھر سے نکلتے وقت پاکدامنی کی ساری ہدایات صرف بیٹی کے لیے ہیں، بیٹے کے لیے کچھ نہیں۔ گھروں میں ماں، بیوی، بہن اور بیٹی کی حیثیت ایک ایسے مزدور سے زیادہ کی نہیں ہے جسے دن بھر 'خدمت' کا مکھوٹا پہن کر مزدوری کرنی ہے اور مزدوری بھی ایسی کہ جس کا معاوضہ ڈانٹ ڈپٹ اور دھتکار کی شکل میں ملنے والا ہے۔ سیر و تفریح اور انجوائے منٹ کا حق صرف مردوں کو حاصل ہے، عورتوں کا کام کھانا بنانا، روتے ہوئے بچوں کو چپ کرانا اور اگر وہ بیمار ہوں تو ان کی دیکھ ریکھ کرنا، گھر کی صاف صفائی کرنا، کپڑے اور برتن دھونا ہے۔

ہمارے تحت الشعور کا حصہ بن چکی ہماری پدری ذہنیت کے یہ محض چند مظاہر ہیں جن کا سرسری تذکرہ یہاں کیا گیا ہے۔ حیف ہے کہ ان میں سے کئی تعصّبات کا خود ساختہ مذہبی جواز تلاش کرنے میں ہم ناکام نہیں رہتے۔ تعصّبات پر مبنی ان روایات کو ہم بلا تکلف مذہب کے نام پر جاری رکھتے ہیں اور یوں مذہب کی بدنامی کا موقع بھی ہم خود ہی اپنے عمل سے فراہم کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام جس خدا شناس، مبنی بر انصاف، پرامن سماج کا نقشہ پیش کرتا ہے وہ ہمارے موجودہ سماج سے بالکل برعکس ہے۔ اسلام عورت اور مرد کی انسانی حیثیت میں نہ صرف یہ کہ خود کوئی تفریق گوارہ نہیں کرتا بلکہ اس کی تردید کرتا ہے۔

ہماری ملی قیادتوں میں 'جلسہ ہائے اصلاح معاشرہ' کا بڑا غلغلہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ان جلسوں میں اس دکھتی رگ پر بھی ہاتھ رکھنے کی ہمت کی جائے جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔ ملت اسلامیہ کو جسے خیر امت کا خصوصی درجہ حاصل ہے، شہادت علی الناس اور اقامت دین کا جو عظیم فرض منصبی ادا کرنا ہے وہ اس طور پر ممکن نہیں کہ امت کی نصف طاقت و قوت کو مفلوج و معطل رکھا جائے۔

سعود فیروز

مختلف مذاہب میں عورت کا تصور

محمد اعظم

عورت اور مرد دونوں کو ہی نسل آدم کہا گیا ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے تمام انسان قابل عزت ہیں۔ انسانیت کے ایک حصے کی ترجمانی اگر مرد کرتا ہے تو دوسرے حصے کی عورت کرتی ہے۔ کوئی معاشرہ ایسا نہیں جو کہ صرف مردوں پر مشتمل ہو اور نہ اس کے برعکس ہے۔ دونوں میں لازم وملزوم کی نسبت ہے۔ معاشرے کی تعمیر وترقی میں جس طرح مرد کا کردار اہمیت کا حامل ہے بعینہ اسی طرح ہی عورت کا کردار بھی کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ معاشرے میں نسل نو کی تربیت عورت ہی کے ہاتھوں ہوتی رہی ہے اور ہو سکتی ہے۔ ماں کی گود بچے کی پہلی تربیت گاہ کے تصور نے عورت کی حیثیت اور کردار کو مزید مستحکم اور مستند بنایا ہے۔ بلکہ ہمارے معاشرے اور تہذیب میں خاندانوں اور نسلوں کے سنورنے اور بگڑنے میں عورت بحیثیت بہن، بیٹی، ساس، بہو اور دیگر تمام رشتوں میں بہت اہم کردار کی حامل ہے۔ سوال یہ ہے کہ عورت کے اس کردار کے ساتھ معاشرے نے کیا رویہ اپنایا؟ عورت کا یہ استحقاق دنیا بھر میں متاثر رہا ہے اور آج بھی ہے۔ بیداری کی تمام تحریکوں کے باوجود بھی عورت زیر عتاب ہی چلی آ رہی ہے اور حالات تبدیل نہیں ہو سکے ہیں۔ مختلف طبقات اور معاشروں میں عورت کی حیثیت پر ڈاکٹر خالد علوی کے بقول: ''یہ بات مسلّم ہے کہ عورت معاشرے میں ایک ایسا ناگزیر عنصر ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ سماجی اور تمدنی اصلاح و بقاء کا انحصار تقریباً اسی عنصر پر ہے۔ عورت کی حیثیت، اس کا کردار وعمل اور اس کی حیات بخش صلاحیتیں معاشرے کے عروج وزوال کا سامان ہیں'' (1)

عورت ومرد نوع انسانی کے دو جزء ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو مستلزم ہیں۔ انسانی معاشرے کو اگر گاڑی سے تشبیہ دی جائے تو مرد اور عورت اس گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ تاہم عورت ہر دور اور ہر زمانے میں ظلم وستم کا شکار رہی ہے اور اپنے حقوق سے محروم رہی ہے۔ ذیل میں مختلف طبقات و معاشرے میں عورت کی کیا حیثیت رہی ہے مختصراً بیان کیا جا رہا ہے۔

یونان

موجودہ مغربی تہذیب کی تہہ میں یونانی فکر ومعاشرت اور رومی قانون و معاشرت بنیاد کے طور پر کارفرما ہیں۔ یونانی معاشرت میں عورت تمام حقوق سے محروم تھی۔ ان کے اساطیری ادب (Mythology) میں ایک خیالی عورت پانڈورا (pandora) کو انسانی مصائب کا موجب قرار دیا گیا تھا۔ بازاروں اور شہروں میں عورتوں کی کھلے عام خرید وفروخت ہوتی تھی۔ اسے کسی چیز کا کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ حتیٰ کہ اپنے ذاتی معاملات میں کسی بھی قسم کا تصرف کرنے کی وہ مجاز نہ تھی۔ عورت مردوں کی دست نگر تھی۔ یونانی سوسائٹی میں عورت کی کوئی وقعت اور کوئی مقام اس کی شایان شان نہ تھا۔ یونانی اپنے دور عروج میں اخلاقی خرابیوں کا شکار تھے۔ مرد اخلاقی اعتبار سے آزاد تھے۔ تاریخ اخلاق یورپ میں عورت کے حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو: ”بحیثیت مجموعی باعصمت یونانی بیوی کا مرتبہ انتہائی پست تھا۔ اس کی زندگی غلامی میں بسر ہوتی تھی۔ لڑکپن میں اپنے والدین کی، جوانی میں اپنے شوہر کی، بیوگی میں اپنے فرزندان کی وراثت میں ہوتی تھی۔ اس کے مقابلے میں اس کے مرد وغیرہ کا حق ہمیشہ راجح سمجھا جاتا تھا۔ طلاق کا حق اسے قانوناً حاصل ضرور تھا، تاہم عملاً وہ اس سے کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی کیوں کہ عدالت میں اس کا ظہار یونانی ناموس وحیا کے منافی تھا“[2]

روم

اہل روم کے یہاں بھی عورت کی کم وبیش وہی حالت تھی جو یونانیوں کے یہاں تھی۔ عورت کو یوم ولادت سے وفات تک ایک زیر نگرانی قیدی کی حیثیت سے رکھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ رحم کا معاملہ نہیں کیا جاتا تھا، مروت کا سلوک نہیں کیا جاتا تھا، مودت ومحبت کا برتاؤ نہیں ہوتا تھا۔ نظام معاشرت میں مرد خاندان کا سردار ہوتا تھا اور اپنے خاندان پر مکمل اختیار رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اسے اپنی بیوی کو قتل کرنے کا بھی اختیار ہوتا تھا۔ عورت خاندانی نظام میں قید تھی۔ وہ گوشت نہیں کھا سکتی تھی۔ گوشت صرف مردوں کی غذا تھی۔ عورت بولنے کا کوئی حق نہ تھا۔ وہ جان بوجھ کر اندھی بنادی گئی تھی۔ گھر سے باہر بھی عورت کی وہی حالت تھی جو گھر کے اندر تھی۔ لیکی رومی لکھتا ہے ”عورت کا مرتبہ رومی قانون نے عرصہ دراز تک نہایت پست رکھا۔ افسر خاندان جو باپ ہوتا تھا یا شوہر اسے اپنے بیوی بچوں پر پورا اختیار تھا وہ جب چاہے عورت کو گھر سے نکال سکتا تھا“[3]

ایران

یونان وروم کی طرح ایران بھی ایک قدیم تہذیبی مرکز رہا ہے۔ مولانا ابوالحسن ندوی کے بقول: ”متمدن دنیا کی تولیت وانتظام میں ایران روم کا شریک تھا لیکن بدقسمتی سے وہ دشمن انسانیت افراد کی سرگرمیوں کا پرانا مرکز تھا۔ وہاں کی اخلاقی بنیادیں زمانہ دراز سے متزلزل چلی آرہی تھیں۔ جن رشتوں سے ازدواجی تعلقات دنیا کے متمدن ومعتدل علاقوں کے باشندے ہمیشہ ناجائز اور غیر قانونی سمجھتے رہے ہیں اور فطری طور پر اس سے نفرت کرتے ہیں، ایرانیوں کو ان کی حرمت وکراہت تسلیم نہیں تھی۔ یزدگرد دوم جس نے پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں حکومت کی اس نے اپنی لڑکی کو زوجیت میں رکھا پھر قتل کر دیا۔ بہرام جو چھٹی صدی عیسوی میں حکمراں تھا اس نے اپنی بہن سے اپنا ازدواجی تعلق رکھا۔“[4]

ایران میں مختلف خیالات کے حکمراں ہوئے ہیں۔ کسی نے عورت کو تباہی وبربادی کا سبب مان کر شادی پر ہی پابندی لگادی تھی، کسی نے مساوات واشتراکیت کی بنیاد پر عورتوں کو سب کے لئے حلال قرار دے دیا اور مال وزن کو مثل آگ، پانی اور چارہ کے مشترک اور عام کر دیا۔ الغرض ایران میں عورتوں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ نوشیرواں عادل کے زمانے میں بھی اس سے انتہائی بے رحمی کا سلوک کیا جاتا تھا۔

یہ رہا دنیا کی بڑی تہذیبوں کا حال۔ اسلام، عیسائیت، یہودیت، ہندومت اور بدھ مت کا شمار دنیا کے بڑے مذاہب میں ہوتا ہے۔ اب ذیل میں مذکورہ مذاہب میں عورت کی کیا حیثیت رہی ہے، اسے بیان کیا جارہا ہے۔

ہندو مذہب اور عورت

ہندو مذہب دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ایک ہے۔ تاریخی لحاظ سے اکثر مورخین کا خیال ہے کہ ہندو مذہب کا آغاز اس وقت ہوا جب آریاؤں نے 17 سو (ق م) برصغیر پر حملہ کیا تھا۔ آریوں کی آمد سے قبل دراوڑ تہذیب میں عورت خاندان کی سربراہ تصور کی جاتی تھی اور اسے عزت واہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جہاں تک ویدک دور کا تعلق ہے اس میں بھی عورت کی حیثیت بہتر نظر آتی ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ عورت کے حقوق کو نظر انداز کیا جانے لگا، چنانچہ منو کے قانون کے مطابق عورت ہمیشہ کمزور اور بے وفا سمجھی گئی ہے اور اس کا ذکر ہمیشہ حقارت کے ساتھ آیا ہے۔[5] جھوٹ بولنا عورت کا ذاتی خاصہ رہا ہے[6] عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ بچپن میں باپ کے اختیار میں رہے، جوانی میں شوہر اور شوہر کی وفات کے بعد بیٹوں کے اختیار میں رہے۔[7] ہندو قوانین کے مطابق اگر شوہر اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہو تو وہ اپنی بیوی کو کسی اور مرد سے تعلقات پیدا کرنے کو کہہ سکتا ہے تاکہ وہ اولاد پیدا کر سکے، یہ عورت دوسرے مرد سے صحبت کرے گی، بچہ جنے گی، لیکن بیوی وہ اس پہلے شوہر کی ہی رہے گی۔ اسی کے گھر میں رہے گی اور پہلا شوہر ہی نان ونفقہ کا ذمہ دار ہوگا۔[8] ستی کی رسم سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندو دھرم میں عورت کی کیا حیثیت رہی ہے۔ شوہر کے فوت ہوتے ہی گویا عورت زندہ درگور ہو جاتی ہے۔ وہ کبھی دوسری شادی نہ کر سکتی، اس کی قسمت

میں طعن وتشنیع اور ذلت وتحقیر کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ وہ عورتیں جو ستی نہ ہوتی تھیں ان کو گھر کی لونڈی اور دیوروں کی خادمہ بن کر رہنا پڑتا۔ ڈکٹر گستاؤلی بان کے مطابق: ''بیواؤں کو اپنے شوہروں کی لاش کے ساتھ جلانے کا ذکر منو شاستر میں نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم ہندوستان میں عام ہو چلی تھی یونانی مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے''۔[9] ستی کی رسم سے پتہ چلتا ہے کہ ہندو عورتوں کو وراثت سے محروم رکھا گیا ہے۔ اس کے رشتہ دار جائیداد لیں گے لیکن اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کو مذہبی تعلیم سے بھی محروم کیا جاتا تھا۔ عورت کو نکاح ثانی کی اجازت نہیں تھی۔ اس کو اختیار تھا چاہے تو ستی ہو جائے یا بیوہ بن کر رہے۔

یہودیت اور عورت

یہودیت کا شمار دنیا کے قدیم مذاہب میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ ایک آسمانی مذہب ہے۔ یہودی خود کو اللہ کی منتخب قوم مانتے ہیں۔ یہ مذہب بنیادی طور پر بنی اسرائیل سے محبت کرتا ہے۔ جو بلا شبہ ایک منتخب قوم تھی جن کی ہدایت کے لیے اللہ تعالی نے بہت سے رسول بھیجے۔ ان کے سب سے بڑے نجات دہندہ حضرت موسیٰؑ تھے، جن کو تورات عطا کی گئی جو یہودی ماخذ ہے۔ اس مذہب کی روایات عورت کے بارے میں اچھا تصور نہیں پیش کرتیں۔ ان کے نزدیک عورت بدطینت اور مکار ہے۔ کیوں کہ اس نے آدم کو بہلا پھسلا کر جنت کا ممنوعہ پھل کھانے پر آمادہ کیا۔ عہد نامہ قدیم میں ہے ''جب اللہ نے آدم سے پوچھا کہ کیا تو نے اس درخت کا پھل کھالیا جس کی بابت میں نے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا تو آدم نے جواب دیا کہ جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھالیا''[10] تو اس حرکت پر اللہ نے اس کو (حوا) مخاطب فرمایا کہ ''میں تیرے حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچہ جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔''[11] مذکورہ بالا آیات سے واضح ہوتا ہے کہ دراصل حوا نے ہی آدم کو گمراہ کیا۔ اس لئے اسے اس جرم کی سزا یہ دی کہ وہ حمل میں انتہائی تکلیف دہ صورت کا سامنا کرے گی اور ہمیشہ مرد کی محکومیت میں رہے گی۔ چنانچہ یہودیت میں عورت کو کسی غلام ومحکوم سے بڑھ کر نہیں مانا گیا ہے۔ عورت مکمل طور پر مرد کی دست نگر ہے۔ وہ مرد کی مرضی کے بنا کوئی کام نہیں کر سکتی، مرد جب چاہے اس کو گھر سے نکال دے (طلاق دے دے)۔ یہودی قانون شریعت کے مطابق عورت کے بارے مساوی حق کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مہر کے علاوہ عورت کسی چیز کی حقدار نہیں،، وراثت میں بھی عورت کا نمبر پوتوں کے بعد آتا ہے۔ مرد وارث کی صورت میں وہ محروم رہے گی۔[12]

بہرحال یہودی قانون وشریعت میں عورت کو ناپاک تصور کیا گیا ہے اور اس دنیا کی تمام آفات ومصائب کا سبب عورت کو مانا گیا ہے۔

عیسائیت اور عورت

عیسائیت میں بھی عورت کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا گیا ہے جیسا یہودیت میں۔ درآں حالیکہ یہودیت کے زوال پذیر ہونے کے بعد مسیحیت نے معاشرے میں خوبصورت اقدار صحیح صورت میں پیش کیں۔ لیکن عیسائیت کی بدقسمتی ہے کہ عیسائیت کی روش عورت کے ساتھ اور بھی زیادہ ناپسندیدہ تھی۔ عیسائیت نے نہ صرف اس کی تحقیر وتذلیل کی بلکہ اسے انسانیت کا مجرم بھی قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک عورت برائی اور مصیبت کی جڑ ہے۔ عیسائی نقطہ نظر کا اندازہ طرطولین کے ان الفاظ سے کیا جا سکتا ہے: ''اے عورتو! تم نہیں جانتیں کہ تم میں سے ہر ایک حوا ہے۔ خدا کا فتویٰ جو تمہاری جنس پر تھا وہ اب بھی تم میں موجود ہے تو پھر جرم بھی تم میں موجود ہوگا، تو تم شیطان کا دروازہ ہو۔ تم ہی نے آسانی سے خدا کی تصویر یعنی مرد کو ضائع کیا۔''[13] سینٹ پال جو موجودہ عیسائیت کا بانی ہے عورت کے بارے میں اس کا خیال ہے'' عورت کو چپ چاپ کمال تابعداری سیکھنا چاہیئے اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے اور وہ مرد پر حکم چلائے بلکہ چپ چاپ رہے کیوں کہ پہلے آدم بنایا گیا اس کے بعد حوا کو، اور آدم نے فریب نہیں کھایا بلکہ عورت فریب کھا کر گناہ میں پڑ گئی''۔[14] کرائم سوسٹم کی رائے عورت کے بارے میں یہ ہے کہ ''عورت ایک ناگزیر برائی، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطر، ایک آراستہ برائی ہے''۔[15]

مسیحی اخلاقیات میں تجرد اور صنفی تعلقات سے کنارہ کشی ہی اصل کمال تھا۔ اس لئے نکاح اور صنفی تعلقات بذات خود ناقابل التفات تھے۔ مسیحی شریعت میں جتنے قوانین بنے اس میں عورت کی حیثیت کو پست رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وراثت وملکیت میں اس کے حق محدود رکھے گئے ہیں۔ وہ خود اپنی آمدنی پر بھی مختار نہیں تھی۔ ہر چیز کا مالک مرد تھا۔ طلاق وخلع کی اجازت نہیں تھی۔ مذہب اور قانون کی وجہ سے نکاح کا تعلق ناقابل انقطاع تھا۔ نکاح ثانی کی اجازت نہیں تھی۔ مسیحی علماء نکاح ثانی کو مہذب زنا کاری کا نام دیتے تھے۔ مسیحی دنیا میں عورت کی زندگی ایک بے بس مخلوق اور مرد کے ہاتھ محض کھلونے کے سوا کچھ نہ تھی۔

بدھ مت اور عورت

بدھ مت کا وجود ہندومت میں رائج غلط رسوم وبدعات کا نتیجہ ہے۔ گوتم بدھ نے عورت ومرد کو کسی حد تک مساوات کی لڑی میں پرونے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے عورتوں کو مذہبی اور سماجی کاموں میں حصہ لینے کی آزادی دی، عورت کو گھر کی حکمرانی کا موقع دیا۔ لیکن دوسری جانب بدھ مت میں حیرت انگیز طور پر عورتوں کو چوروں سے تشبیہ دی گئی ہے ''کہ ان کے پاس چوروں کی طرح متعدد حربے ہیں اور سچ کا ان کے پاس گزر نہیں۔''[16]

اسلام اور عورت

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کی آمد سے قبل پوری دنیا میں عورت کا وجود ذلت، شرم اور باعث ننگ و عار تھا۔ اگر کسی کے یہاں بیٹی پیدا ہوئی تو یہ بات باپ کے لئے باعث عیب تھی۔ جاہل افراد سسرالی رشتہ کو کمتر سمجھتے تھے۔ بعض سنگدل باپ اپنی بیٹی کو زندہ در گور کر دیتے تھے۔ ارشاد باری ہے ''اللہ نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا ہے۔'' (النساء:1) یہ آیت ان لوگوں کی تردید کرتی ہے کہ جو عورت کو انسان تصور نہیں کرتے۔ قرآن میں ایسی بہت سی آیات ہیں کہ جن میں عورت کو عمدہ مخلوق کہا گیا ہے۔ ارشاد ہے ''اور جو کوئی نیک کام کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، اور صاحب ایمان بھی ہوگا تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں ہوگا۔'' (النساء:124) اسلام نے اپنی عمدہ اور اعلیٰ تعلیمات میں ہر طرح کے حقوق میں عورتوں کو شریک کیا ہے۔ کسی بھی حق سے عورتوں کو محروم نہیں رکھا ہے۔ اسلام نے ان تمام بدعات و رسومات کا مکمل خاتمہ کیا ہے جو قبل از اسلام عورتوں سے متعلق رائج تھیں۔ مثلاً ایام حیض میں عورت کسی سے مل نہیں سکتی، کسی کے پاس بیٹھ نہیں سکتی، گھر سے باہر نہیں جاسکتی وغیرہ۔ بالغ لڑکی اپنی جائیداد (وراثت) کو اپنی مرضی سے فروخت کر سکتی ہے۔ اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتا۔ عورت تجارت کر سکتی ہے اور اس کی اولین و بہترین مثال حضرت خدیجہؓ ہیں جو بین الاقوامی سطح کی bussiness women تھیں۔ دوسرے مذاہب کی عورتوں کو یہ سب کرنے کے لیے اپنے گھر سے نکلنا پڑا یا اپنے حدود سے باہر آنا پڑا۔ مگر مسلم عورتیں اپنے حدود میں یہ سب کرتی تھیں اور کر سکتی ہیں۔ نکاح کے موقع پر مرد بہ طور مہر رقم کی ادائیگی کرے اور عورت اس رقم کو اپنی مرضی سے جہاں چاہے خرچ کر سکتی ہے، جسے چاہے دے سکتی ہے۔ اسلام نے عورت کو ماں ہونے کی حیثیت سے مردوں کے بالمقابل تین گنا زیادہ درجہ بلند کیا۔ حدیث پاک کے وہ الفاظ یاد کریں جب ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ میرے ماں باپ دونوں میں سے کون میری توجہ کا زیادہ مستحق ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تمہاری ماں۔'' آپ ﷺ نے تین بار ماں کہا اور چوتھی بار میں کہا ''تمہارا باپ۔'' اگر کوئی شخص کسی معصوم اور بھلی عورت پر بیہودہ الزام لگائے تو اسے بھرے بازار میں اسّی کوڑے لگانے کی سزا بتائی گئی ہے اور زنا بالجبر کے لیے تو اس بھی زیادہ سخت سزا اور تعزیرات ہیں۔ دین فطرت نے عورتوں کو حق رائے دہی عطا کیا۔ امریکہ نے 1976 میں عورتوں کو جنگ میں شامل کیا جب کہ مسلمان عورتیں غزوات میں نہ صرف شامل ہوتی تھیں بلکہ جنگ بازوں کی مرہم پٹی بھی کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کا اسلامی معلومات، تاریخ، ریاضی، مسائل وفقہ اور ادب وشاعری میں کوئی ثانی نہیں۔ ان کے تفقہ فی الدین پر 88/ اسکالروں کی گواہی موجود ہے۔ خاتون جنت حضرت فاطمہؓ کھیتی کرتیں اور رسول اللہ ﷺ اس اناج کو کھاتے۔ حضرت سودہؓ چمڑے کا کاروبار کرتی تھیں۔ حضرت خولہؓ اور صفیہؓ عطر تیار کرتی تھیں۔ حضرت سمیہؓ اسلام کی راہ میں شہادت پانے والی پہلی خوش نصیب اور قابل رشک خاتون تھیں۔ حضرت فاطمہ بنت خطابؓ حضرت عمرؓ کے مشرف بہ اسلام ہونے کا ذریعہ بنیں۔ حضرت خنساءؓ مشہور مرثیہ گو شاعرہ تھیں۔ جنگوں میں عورتیں مشورے دیا کرتیں اور ان کے مشوروں کو قبول کیا جاتا۔

مذکورہ تمام خواتین اسلام نے پردے میں رہ کر تاریخی کارنامے انجام دیے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کا مقام اتنا بلند کر دیا کہ اب اس کی کوئی بلندی قطعاً نہیں ہوسکتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم خواتین زیادہ سے زیادہ اپنی اسلامی معلومات میں اضافہ کریں اور انہیں پھیلائیں۔ وہ اپنے حقوق کی نگہبان خود بنیں۔ کیوں کہ اسلام نے عورت کو وہ مقام عطا کیا جو کسی بھی سماج میں عورت کو حاصل نہیں ہے۔

MOHAMMAD AZAM
Department of Theology
Aligarh Muslim University, Aligarh
Email: mohammadazamalig@gmail.com

مراجع و مصادر

(۱) علوی، ڈاکٹر خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، الفیصل ناشران وتاجران اردو بازار، لاہور، ص ۴۶۱۔
(۲) لیکی، لیکی رومی، تاریخ اخلاق یورپ، ترجمہ از عبدالماجد بی، اے، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ (۱۹۲۸) ج ۲ ص ۱۹۰۔ (۳) ایضاً ص ۱۹۳۔
(۴) حدوٹی، مولانا محمود الرشید حدوٹی، اسلام اور عورت، تحقیق وتصنیف، لاہور (۲۰۰۱) ص ۱۱۔
(۵) بان، گستاؤلی بان، تمدن ہند ترجمہ از سید علی بلگرامی، مطبوعہ شمشی آگرہ (۱۹۱۳) ص ۲۳۶۔
(۶) منو، منوسمرتی، ادھیائے ۹، منتر ۱۷۔ (۷) ایضاً، ادھیائے ۵، منتر ۱۴۷۔
(۸) ایضاً، ادھیائے ۹، منتر ۱۰۴، ۱۰۵۔ (۹) تمدن ہند، ص ۲۳۸۔
(۱۰) کتاب پیدائش، ب ۳، آیت ۱۱۔ (۱۱) ایضاً، آیت ۱۶۔
(۱۲) انسائیکلو پیڈیا آف برناٹیکا، مقالہ یہودیت۔
(۱۳) اسلام کا معاشرتی نظام، ص ۴۶۶۔ (۱۴) ایضاً ص ۴۶۶۔
(۱۵) کرائم سوسٹم، کرنتوں کے نام پہلا خط، ب ۱۱، آیت ۳ تا ۱۰۔
(۱۶) انسائیکلو پیڈیا آف ریلی جن، بدھ مت۔

عصر حاضر کے چیلنجز اور مسلم خواتین کی ترقی

ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر آمنہ تحسین

تعارف: عصرِ حاضر کو ''نالج پاور اور سائنس وٹکنالوجی کے عروج کا دور'' قرار دیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ گذرے برسوں میں سائنس وٹکنالوجی کی تیز رفتار ترقی نے نت نئے اور حیرت انگیز ایجادات سے دنیا کو متعارف کروایا ہے۔ حیران کر دینے والی یہ ایجادات اور اشیاء کبھی ذہنی سطح پر ناقابلِ یقین ضرور لگتی ہیں لیکن حقیقت بن کر ہمارے سامنے موجود ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں کسی نہ کسی سطح پر ہم نہ صرف ان سے مربوط ہیں بلکہ ہمارے لیے ان اشیاء کا استعمال ناگزیر بن گیا ہے۔ ترقی کی یہ رفتار کسی ایک خطہ زمین تک محدود نہیں رہ گئی ہے بلکہ ''عالم کاری (گلوبا لائزیشن)'' کے نتیجے میں دنیا کی تقریباً تمام سرحدوں تک آ پہنچی ہے۔ اس تیز رفتار ترقی نے انسانی زندگی کو بڑا متاثر کیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں زندگی کے معیارات، ضروریات اور تقاضے تبدیل ہو گئے ہیں اور سیاسی، سماجی، تعلیمی، معاشی، تہذیبی اور دیگر شعبوں میں بے شمار نئی تحدیات (Chalenges) پیدا ہو گئی ہیں۔ جن کا سامنا کرنا تمام افراد کے لیے اب ناگزیر بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دور میں ترقی کی رفتار کے ساتھ ساتھ زندگی کے معیارات بدلتے رہتے ہیں اور جدید تقاضے افراد کو ہم قدم ہو کر ساتھ چلنے کے لیے آواز دیتے رہتے ہیں۔ اس آواز پر توجہ دینے اور مثبت انداز میں عمل پیرا ہونے والے افراد کامیابی کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔

عالم کاری، سائنس وٹکنالوجی کی تیز رفتار ترقی، معیشت کے بدلتے ذرائع اور سیاسی وسماجی تبدیلیوں کے تناظر میں ابھرنے والی تحدیات کا جائزہ لیا جائے تو جو اہم نکات سامنے آتے ہیں ان میں اعلیٰ تعلیم کا حصول، پیشہ وارانہ ہنر مندی، انفارمیشن ٹکنالوجی کے استعمال میں مہارت، سرکاری وغیر سرکاری سہولتوں اور وسائل کی بھر پور معلومات، مسابقتی دور کے تمام شعبوں میں مقابلہ کرنے کی صلاحیت نیز معاشی ذرائع میں جدت اور وسعت کے ساتھ ساتھ ترقی کے مرکزی دھارے (Mainstream) میں شمولیت اور بنیادی وشہری حقوق اور مراعات سے واقفیت نیز ان کا استعمال شامل ہیں۔ ان ہمہ پہلو تحدیات کا سامنا کرنا آج تقریباً تمام افراد کے لیے لازمی ہو گیا ہے۔ جو افراد اطمینان بخش اور باوقار سماجی زندگی گذارنے کے لیے ان تحدیات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بدلتے وقت کے تقاضوں پر

کھرے اترنے کی خود میں صلاحیت پیدا کرتے ہیں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں اور ملک وقوم کی ترقی کے مرکزی دھارے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اگر چہ کہ مختلف ممالک واقوام کے سماجی وتہذیبی تناظر میں ان تحدیات کی نوعیت جدا جدا ہوتی ہے اور زندگی کی بقا اور ارتقاء کے لیے اسی کے مطابق انفرادی واجتماعی کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔ تاہم عصرِ حاضر کی تیز رفتار ترقی میں ابھرنے والی تحدیات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس پس منظر میں ہندوستان جیسے مختلف مذاہب اور طبقات پر مشتمل کثیر آبادی والے ملک کا جائزہ لیں تو بے شمار تحدیات سامنے آتی ہیں جو عصرِ حاضر میں اس ملک کے افراد بالخصوص خواتین کو درپیش ہیں۔ مجموعی طور پر ہندوستانی خواتین کا جائزہ لیں تو وہ متضاد صورت حال کی حامل نظر آتی ہیں۔ جہاں وہ تعلیم یافتہ اور ایک بااختیار فرد کی حیثیت کی حامل ہیں وہیں وہ مختلف النوع مسائل وتحدیات سے دو چار بھی نظر آتی ہیں۔ جبکہ مزید گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو ہندوستانی خواتین، مذہب، طبقہ، ذات پات اور صنف کے دائرے میں جکڑی بے شمار مسائل میں گھری حاشیائی حیثیت کی مالک نظر آتی ہیں۔ اس تناظر میں مسلم خواتین کے صورت حال اور ان کی ترقی کے لیے درپیش تحدیات کا جائزہ نہایت اہمیت کا حامل لگتا ہے۔

مطالعے کے مقاصد: عالمی وقومی سطح پر بیسویں صدی کئی اعتبار سے نہایت اہمیت کی حامل صدی رہی۔ جہاں اس صدی میں دنیا کی تاریخ وجغرافیہ، معاشرت وتہذیب، علم وادب میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں وہیں سماج میں خواتین کے بہتر مقام ومرتبہ کو لے کر شعور بھی کافی بیدار ہوا اور مختلف اقدامات کے نتیجہ میں کسی حد تک صدیوں سے چلی آ رہی خواتین کی پست حیثیت میں بہتری آئی۔ جب انہیں مواقع ملے تو تاریخی ادوار میں گم شدہ اور مسخ شدہ ان کا وجود تعلیم یافتہ، باشعور وبااختیار فرد کی حیثیت سے مختلف شعبہ ہائے حیات میں اپنی حصّہ داریوں اور صلاحیتوں کا لوہا منوانے لگا۔ اگر چہ کہ یہ صورتِ حال تمام ممالک میں یکساں نہیں ہے بلکہ بیشتر ممالک بشمول ہندوستان میں خواتین کی آبادی کی بڑی شرح آج بھی ناخواندگی، پسماندگی، غربت اور بے شمار صنفی مسائل کا شکار ہیں۔ از ماضی تا حال خواتین کی حیثیت کے اس بدلتے موقف اور عصرِ حاضر کے تناظر میں یہ جاننا مقصد ہے کہ

- عصرِ حاضر میں ہندوستانی مسلم خواتین اپنا کیا موقف رکھتی ہیں؟
- ہندوستان میں مسلم خواتین کس طرح کے مسائل سے دو چار ہیں؟
- کیا ہندوستانی مسلم خواتین عصری تحدیات کا مقابلہ کرنے اور ترقی کے مرکزی دھارے میں شامل ہونے کے قابل ہیں؟

طریقہ کار: زیرِ بحث مقالہ تجزیاتی تحقیق پر مبنی ہے۔ منتخبہ موضوع پر مطالعہ کے لیے متنی تجزیہ کا استعمال کیا گیا۔ مسلم خواتین کی صورت حال اور ان کے مسائل وتحدیات کو جاننے کے لیے سرکاری وغیر سرکاری سطح پر کی گئی تحقیقات اور شائع شدہ سروے رپورٹس نیز مردم شماری رپورٹ ودیگر ثانوی مراجع کو بنیاد بنایا گیا۔ اعداد وشمار اور متن کے تجزیے کی بنیاد پر نتائج اخذ کیے گئے۔

مطالعہ وتجزیہ: ہندوستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ اس ملک کی ایک خاص تاریخی، سیاسی، سماجی، مذہبی وتہذیبی شناخت رہی ہے۔ اس ملک کی کل آبادی مختلف مذاہب اور زبان وتہذیب کے حامل افراد پر مشتمل ہے۔ ملک کی آبادی کا تقریباً چودہ فیصد حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ کثیر آبادی والے اس ملک میں مسلمان قوم کو سب سے بڑی اقلیت کا درجہ حاصل ہے۔ دستورِ ہند کے مطابق مسلمانوں کو بھی بہ حیثیت ہندوستانی شہری ترقی کے اتنے ہی مساویانہ مواقع اور حقوق حاصل ہیں جتنے کہ اس ملک کے دیگر طبقات کو حاصل ہیں۔ باوجود اس کے مسلمانوں کے صورت حال کے متعلق شائع شدہ مختلف رپورٹس کے نتائج ظاہر کرتے ہیں کہ مسلمان تمام شعبہ ہائے حیات میں دیگر مذاہب کے افراد کے مقابلے میں پچھڑے ہوئے ہیں اور ترقی کے مرکزی دھارے میں شامل نہیں ہیں۔ مسلمان طبقہ کی بڑی تعداد عصرِ حاضر کے بدلتے معیارات اور تقاضوں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے قابل نہیں ہیں۔ انھیں تعلیمی، سماجی، معاشی، ثقافتی اور سیاسی سطح پر کئی تحدیات کا سامنا ہے۔ مسلمانوں کی مجموعی صورتحال کے مقابلہ میں خواتین کا صورت حال اور بھی ابتر اور پسماندہ ہے۔ مسلم خواتین ترقی کے نشانہ سے بہت دور ہیں۔ اگر چہ کہ ملک کی آزادی کے بعد لڑکیوں وخواتین کی تعلیم وترقی کے لیے گونا گوں اقدامات اختیار کیے گئے لیکن ان کے اثرات ملک کے تمام طبقات کی خواتین پر مرتب نہیں ہو سکے، بالخصوص مسلم خواتین تعلیم وترقی کے میدان میں کافی پچھڑ گئیں۔ اس ضمن میں اوشا نائر کی رپورٹ (2007) کا ایک اہم اقتباس یہاں پیش کرنا بے جا نہ ہوگا۔ وہ لکھتی ہیں:

"Muslim girls and Women lag behind their male counterparts and women of all other communities. The Nation is committed to educational advancement and empowerment of all Indian women in persuance of the Constitutional commitment of equality and life with dignity as reflected in our National policy of Education,1986 and its revised Programme of Action 1992. Further, we stand committed to international convenants loke the Declaration of Human Rights, CEDAW, Rights of the Child, ICPD, Millenium Development Goals (MDG) among others."

گذرے برسوں میں قومی وریاستی سطح پر تحقیقاتی ایجنسیوں اور جامعات کے تحت مسلمانوں کے مسائل جاننے کی بڑی سنجیدہ کوششیں ہوئی ہیں اور نہایت اہم رپورٹس منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ان میں ایک سچر کمیٹی

رپورٹ بھی ہے جو 2006 میں شائع ہوئی۔ سچر کمیٹی رپورٹ کے مطابق، ''ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے مسلمانوں کی حالت میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔۔۔مسلم فرقہ ترقی کے عمل کے تمام شعبوں میں نقصانات اور محرومیوں سے دوچار ہے۔ زیر غور تمام اشاریوں کے لحاظ سے مسلمانوں کی حالت کم وبیش ایس سی، ایس ٹی سے کچھ بہتر مگر ہندو او بی سی، دیگر اقلیتوں اور عام ہندوؤں ہندوؤں سے بدتر ہے۔'' (ص، 231)

سچر کمیٹی رپورٹ میں جہاں مجموعی طور پر مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی اور معاشی حیثیت کی افسوسناک تصویر نظر آتی ہے وہیں اس رپورٹ میں مسلم خواتین کے موقف کے نقوش کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اگرچہ کہ کمیٹی نے خواتین کی مکمل صورت حال کو جاننے کی باقاعدہ اور منظم کوشش نہیں کی لیکن اس رپورٹ میں جس طرح کے نتائج اخذ کیے گئے ان سے ہندوستان میں مسلم مرد افراد کے مقابلے میں خواتین کی پست ترین صورت حال کا اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے۔ ذیل میں اس رپورٹ کے مختلف انکشافات سے چند اقتباسات کو یکجا کیا گیا ہے تاکہ مسلم خواتین کی تعلیمی، صحّی، معاشی وسماجی حیثیت کے خدوخال واضح ہوسکیں۔ یہ سطور ملاحظہ ہوں:

1۔ مسلم خواتین خواندگی اور تعلیم میں ہندوستان کی ایس سی، ایس ٹی کے علاوہ دیگر پسماندہ خواتین اور دوسری اقلیتی خواتین سے بھی پچھڑی ہوئی ہیں۔
2۔ شدید غربت مسلم بچیوں میں تعلیمی سلسلہ منقطع کرنے کا اصل سبب ہے۔
3۔ زیادہ تر مسلم خواتین گھروں میں رہ کر کیے جانے والے کاموں سے وابستہ ہیں۔ اسی لیے وہ دوسروں پر منحصر ہوتی ہیں۔
4۔ عصرِ حاضر میں گھریلو روزگار ختم ہونے کی وجہ سے مسلم خواتین سخت افلاس کا شکار ہیں۔
5۔ گھروں میں رہ کر کام کرنے والی خواتین پیداواری سلسلے کی نچلی سطح پر پہنچ گئی ہیں۔
6۔ مسلم خواتین میں غریبی، تعلیم اور تکنیکی مہارت میں کمی کے نتیجے میں ہنر مندی نہیں ہوتی۔ جس کے نتیجے میں ان کی آمدنی بھی کم ہوجاتی ہے۔
7۔ مسلم خواتین کی صحت کے مسائل رصحت کی ابتری تشویش ناک حد تک بدتر ہے۔
8۔ مسلمان بطورِ خاص خواتین حکومت کی ترقیاتی اسکیموں تک بالکل نہیں پہنچ پاتے۔
9۔ مسابقتی امتحانوں میں مسلم لڑکیوں کی کارکردگی دوسروں کے مقابلے میں نہایت کم ہے۔

سچر کمیٹی رپورٹ کی اشاعت سے قبل اور مابعد شائع ہونے والی رپورٹس سے بھی مسلم خواتین کے پسماندہ صورت حال کی تصویریں جھلکتی ہیں۔ مسلم خواتین اپنے حقوق سے ناواقفیت اور کم تعلیم وغربت کی وجہ سے ہندوستان کی دیگر خواتین کے مقابلے پست ترین صورت حال کی حامل ہیں۔ (سیما قاضی 1999)۔ ہندوستان میں مسلم خواتین بہ حیثیت شہری عدم مساوی مقام کی حامل ہیں۔ حقوق ومراعات سے ان کی محرومی اور نقصان کی تین وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اقلیتی طبقہ کی فرد ہیں۔ دوم یہ کہ وہ ایک ''عورت'' ہے اور تیسری وجہ یہ کہ وہ ایک غریب عورت ہے۔ ان اسباب کے علاوہ مسلم خواتین معاشرتی سطح پر برتے جانے والے صنفی امتیازات اور عدم مساوات کا بھی شکار ہیں۔ یہ تمام عوامل مسلم خواتین کی ''ساختیاتی بے اختیاری'' کو فروغ دیتے ہیں۔ (زویا حسن 2004)۔

2011 کی مردم شماری رپورٹ میں مسلم خواتین کی خواندگی کا فیصد 51.9 اور مسلم مردوں میں خواندگی 62.41 ریکارڈ کیا گیا، جب کہ دیگر مذاہب کی خواتین میں خواندگی کا تناسب اس سے بہتر رہا۔ جیسے ہندو مذہب کی خواتین 55.98 فیصد خواندہ ہیں اور عیسائی 71.97 فیصد، سکھ 63.29 فیصد اور سب سے زیادہ خواندگی کا فیصد یعنی 84.93 جین مذہب کی خواتین میں رہا۔ مسلم لڑکیوں کو ابتدائی جماعتوں میں داخلہ تو دلوایا جاتا ہے لیکن جیسے جیسے ان کے تعلیمی مدارج بڑھتے جاتے ہیں ان کی ترکِ تعلیم بھی بڑھتی جاتی ہے۔ کم عمری کی شادی اور عائلی مسائل سے مسلم خواتین آج بھی جوجھ رہی ہیں (سیدہ سیدین 1999)۔ بیشتر مسلم لڑکیاں بے شمار مسائل کی بناء پر ثانوی سطح پر یا دسویں جماعت کے بعد ترکِ تعلیم پر مجبور ہوجاتی ہیں۔ اسی لیے اعلیٰ تعلیم تک پہنچ نہیں پاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم میں ان کی شرکت نہایت کم ہوجاتی ہے۔ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نے نیشنل سیمپل سروے (2004-2005) کی بنیاد پر ایک رپورٹ جاری کی۔ اس رپورٹ کے مطابق اعلیٰ تعلیم میں مسلم طالبات کا فیصد صرف 5.81 ہے جبکہ ہندو مذہب کی خواتین کا فیصد 9.32، عیسائی 16.02 اور سکھ مت کی خواتین کا فیصد 12.25 ہے۔ (یو جی سی، 2009)۔ آج بھی مسلم معاشرے میں بڑی تعداد ایسے خاندانوں کی ہے جن کی لڑکیاں پہلی گریجویٹ کی حیثیت سے اپنے تعلیمی مدارج طے کر رہی ہیں (تحسین 2019)۔ مسلم معاشرے میں لڑکیوں کو دینی تعلیم دلوانے کا رواج عام ہے۔ بلکہ پچھلی دہائیوں میں اس رجحان میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ لہٰذا مختلف شہروں و دیہاتوں میں لڑکیوں کے لیے کئی دینی مدارس کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ جہاں بنیادی اسلامی تعلیم کے علاوہ حافظہ، عالمہ، فاضلہ اور دکتورہ کی اسناد کے لیے تعلیم دی جارہی ہے۔ ان مدارس کے قیام سے مسلم لڑکیوں میں خواندگی کا فیصد بڑھ رہا ہے اور غیر روایتی تعلیم کے ذریعہ وہ مذہبی علوم سیکھ رہی ہیں تاہم دینی مدارس سے فارغ التحصیل طالبات پر کیے گئے سروے میں ایک حقیقت یہ سامنے آئی کہ ان مدارس کی تعلیم یافتہ لڑکیاں سماج

میں اپنے معاشی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے دیگر شعبہ جات میں روزگار حاصل کرنے میں سخت دشواری محسوس کر رہی ہیں۔ روزگار کا حصول ان کے لیے ایک بڑا چیلنج بنا ہوا ہے۔ مذکورہ طالبات نے اس دشواری کی اہم وجہ دینی تعلیمی نصاب کے ساتھ عصری تعلیم اور ماہرانہ صلاحیتوں کے فروغ کے تربیتی پروگرامس کی عدم شمولیت کو قرار دیا۔ (تحسین 2015)

ہندوستان میں مسلم خواتین کی تعلیمی حیثیت کے علاوہ معاشی حیثیت یا کام میں ان کی حصہ داری (work participation rate) کا جائزہ لیں تو نہایت مایوس کن صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ سال 2001 کی مردم شماری کے مطابق معاشی سرگرمیوں میں ان کی حصّہ داری 14.1 تھی جب کہ 2011 میں کسی قدر بڑھ کر 14.8 فیصد ہوئی ہے۔ جو قومی اوسط سے نہایت کم ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تعلیم و ماہرانہ تربیت کی کمی اور دیگر سماجی و ثقافتی رکاوٹوں کے باعث مسلم خواتین گھریلو سطح کے کام انجام دیتی ہیں۔ دراصل عرصہ دراز سے مسلم خواتین متعدد اہم دستکاری اور گھریلو صنعتوں سے وابستہ ہیں اور ہندوستان کی معیشت کو بڑھانے میں اہم کارکن کا فریضہ نبھاتی آئی ہیں۔ لیکن وہ ہندوستان کی جیسے "Invisible workforce" ہیں۔ چونکہ مسلم خواتین زیادہ تر معاشی سرگرمیاں گھریلو سطح پر ہی انجام دیتی ہیں اسی لیے ان کی اجرت بھی کم ہوتی ہے۔ لہٰذا مسلسل محنت کے باوجود بیشتر مسلم خواتین کی غربت کی سطح میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو پاتی ہے۔ علاوہ ازیں ان کے کام غیر منظم شعبہ سے جڑے ہوتے ہیں جس کا کوئی باقاعدہ نظم نہیں ہوتا لہٰذا انھیں قومی اعداد و شمار میں شامل نہیں کیا جاتا اسی لیے مسلم خواتین کی کاروبار یا مختلف صنعتوں میں اہم حصّہ داری ہونے کے باوجود مجموعی ترقی کے مرکزی دھارے (Mainstream) میں شامل نہیں کیے جاتے۔

درجہ بالا مذکور حقایق کے علاوہ مسلم خواتین بے شمار سماجی مسائل سے بھی دوچار ہیں۔ ہندوستان میں بڑھتی فرقہ واریت، مذہبی شدت پسندی کی بناء پر گذرے برسوں میں ملک کے کئی شہروں میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات اس بات کے کھلے ثبوت ہیں کہ ان سے مسلم خواتین تعلیمی، سماجی، معاشی اور صحی اعتبار سے کس حد تک متاثر ہوئیں ہیں۔ ملک کے کئی ایسے علاقے ہیں جہاں سے عدم تحفظ اور خوف و دہشت کے عالم میں بے شمار خاندانوں کو نقلِ مکانی کرنی پڑی۔ آج وہ خاندان کسم پرسی کی حالت میں اپنی زندگی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ایسے حالات میں مسلم لڑکیوں کی تعلیم و ترقی اور ان کے تحفظ کی طرف توجہ دینا ایک بڑا چیلنج بن گیا ہے۔ دوسری طرف ایسے پریشان کن حالات سے دوچار خاندانوں کی خواتین نہایت چھوٹے کام بھی کرنے پر مجبور ہو رہی ہیں تاکہ کچھ ذریعہ آمدنی ہو اور بھوک کو مٹایا جاسکے۔ ان شورش زدہ حالات کے پس منظر میں ریاستِ جموں و کشمیر کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ سیاسی و سماجی عدم استحکام کے حالات نے وہاں کی مسلم خواتین کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ وہ بے شمار مسائل میں گھر گئی ہیں۔ وہاں کے شورش زدہ حالات میں مرد افراد کی اموات، گم شدگی یا حصولِ معاش کے لیے نقلِ مکانی کے نتیجے میں جہاں "خاتون سربراہ خاندان" کا اضافہ ہو رہا ہے وہیں غربت میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے۔

مختلف رپورٹس اور مطبوعات کے جائزے سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ سیاسی و سماجی دائروں کے علاوہ خاندانی سطح پر بھی مسلم خواتین کئی عائلی مسائل میں گھری ہوئی ہیں۔ ہندوستان کے تہذیبی عناصر نے مسلم سماج کو بھی اپنے رنگ میں پوری طرح رنگ ڈالا ہے۔ ہندوستان کے دیگر مذاہب کی طرح مسلم معاشرہ میں خواتین سے متعلق کئی نظریات، رواج، رسومات اور روایتیں فروغ پا گئی ہیں۔ اگرچہ کہ اسلام میں اس طرح کی کوئی لغویات نہیں ہیں جو خواتین کے درجات کو کسی بھی حیثیت سے کم کرتی ہوں۔ بلکہ مذہبِ اسلام نے چودہ سو برس قبل خواتین کو بے شمار حقوق دے کر انہیں ایک باوقار سماجی زندگی کا حق دار بنایا اور تمام دنیا کے سامنے حقوقِ نسواں کا بہترین ماڈل پیش کیا۔ مذہبِ اسلام نے خواتین کو مردوں کے برابر زندہ رہنے کا حق، تعلیم حاصل کرنے کا حق، وراثت کا حق، اقتصادی طور پر خود کفیل ہونے کا حق، فیصلہ سازی کا حق، اور اظہارِ رائے کی آزادی کا حق دے کر معاشرہ کی اہم فرد کا درجہ دیا اور اسے ترقی کے تمام مواقع عطا کیے۔ لیکن مسلم معاشرہ نے گذری صدیوں میں اپنے فکر و عمل میں تبدیلی سے اسلام کے دیے گئے اس ماڈل کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ اسلام کے معاشرتی نظام نے بدلتے وقت کے تقاضوں سے جڑنے اور اس سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی آزادی سے مرد و خواتین دونوں کو سرفراز کیا اور "صنفی مساوات" کی بنیاد پر دنیا کو 'پائیدار

ترقی'' کا تصور دیا۔ اس ضمن میں مختلف آیات، احادیث اور عہدِ نبوی کے واقعات اور بعد کے ادوار سے نمایاں افراد و کارناموں کے حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جن کی مدد سے ہم مذہبِ اسلام میں خواتین کے وجود کی اہمیت اور ماضی کی کامیاب و ترقی یافتہ مسلم خواتین کی تصویر بخوبی دیکھ سکتے ہیں تاہم عصرِ حاضر میں عالمی سطح پر مسلم خواتین کے صورت حال کی تصویر ماضی کی مسلم خواتین سے بالکل برعکس ہے اور انتہائی تشویشناک حد تک خراب ہے۔

مسلم معاشرے میں بڑی تعداد ایسے افراد کی ہے جنہوں نے اسلامی تعلیمات کے بالکل برخلاف خواتین کو بنیادی و شرعی حقوق سے محروم رکھا ہوا ہے۔ اسلام کے بتائے ہوئے نظام پر عمل نہ کرنے کا ہی نتیجہ ہے کہ بیشتر لڑکیاں و خواتین جہیز کی رسم، شادی میں مشکلات نیز طلاق و خلع کے مسائل سے جوجھ رہی ہیں۔ مہیلا کورٹس و پولیس اسٹیشنوں میں درج کیے گئے مقدمات، دارالقضاۃ اور فیملی کورٹس میں برسوں سے زیرِ دوراں مقدمات یا قضاۃ کے دفتر میں موجود، طلاق و خلع کے سینکڑوں ریکارڈز مسلم معاشرے کے انتشار و خاندانی نظام کی بنیادوں میں دراڑ کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ جس سے نہ صرف مسلم خواتین کی حیثیت متاثر ہوئی چلی آ رہی ہے بلکہ نئی نسل پر بھی اس کے منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ سماجی سطح پر عدم تحفظ، فرقہ واریت، علاقہ واریت، سماجی تعصّبات، خواتین کے متعلق خود مسلم معاشرہ کے ذہنی تحفظات، صنفی تعصبات اور پدرسری نظریات جہاں مسلم خواتین کی تعلیم و ترقی میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں وہیں خود مسلم خواتین کی فرسودہ خیالی، احساسِ کمتری، بے شعوری، اپنے دستوری اور شرعی حقوق سے ناواقفیت اور اپنے وجود کی اہمیت و اپنی صلاحیتوں سے بے نیازی اور تساہل نے بھی انھیں پسماندہ بنا رکھا ہے۔ الغرض ایسے کئی عوامل ہیں جو عرصہ دراز سے مسلم خواتین کی پسماندگی کا باعث بنے چلے آ رہے ہیں۔

مابعد سچر کمیٹی رپورٹ مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے لیے اپنائے گئے اقدامات نیز مسلم معاشرہ پر مرتب ہونے والے اثرات پر فی زمانہ کئی مطالعات منظرِ عام پر آئے ہیں۔ جن کے مجموعی جائزے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وقت کے گذرنے کے باوجود مسلم معاشرے میں خواتین کی صورت حال میں خاطر خواہ تبدیلیاں واقع نہیں ہوئیں اور مسلم خواتین مجموعی طور پر جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے نیز ترقی کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے مکمل طور پر تیار نہیں ہیں۔ اگرچہ کہ گذرے برسوں میں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر کئی اقدامات اختیار کیے گئے۔ باوجود اس کے مختلف رپورٹس اور اعداد و شمار کے تجزیہ سے ہندوستان میں مسلم خواتین کی تعلیمی، معاشی، سماجی اور صحتی اعتبار سے نہایت پست حیثیت و زبوں حالی کی تصویر سامنے آئی ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر یہی سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ جب مذہبِ اسلام نے خواتین کو تمام بنیادی حقوق سے سرفراز کیا اور بہ حیثیت ہندوستانی شہری کے، انہیں تمام دستوری اور قانونی تحفظ، حقوق اور مراعات حاصل ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ تمام احکامات، اقدامات اور عملی کوششیں رائیگاں ثابت ہو رہی ہیں؟ ہندوستان میں مسلم خواتین کی حیثیت آخر اتنی پسماندہ کیوں بنی ہوئی ہے؟ حد درجہ پست حیثیت کی مالک مسلم خاتون دورِ حاضر کی مادی ضرورتوں کی تکمیل نیز بہتر سماجی زندگی کے تقاضوں کو کس طرح سے پورا کر پائے گی؟ اور عہدِ حاضر کی تحدیات کا سامنا کس طرح کر پائے گی؟

اختتامیہ: گزشتہ سطروں میں پیش کیے گئے نکات کے تناظر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مسلم خواتین کی اس پسماندہ اور حاشیائی حیثیت میں تبدیلی اور ان کی ترقی تب ہی ممکن ہے جب خواتین سے متعلق مسلم معاشرہ کی سوچ، فکر اور عمل میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ مسلم معاشرہ صنفی تعصّبات اور ذہنی بندشوں سے باہر نکل کر خواتین کی تعلیم اور جدید تقاضوں کے مطابق ان کی معاشی حصہ داریوں کو تسلیم کرے گا۔ نیز انہیں باشعور و با اختیار بننے کے تمام تر مواقع فراہم کرے گا۔ مسلم معاشرہ تعلیم و تربیت گاہوں کے قیام کی طرف پہلے کی بہ نسبت زیادہ توجہ دے تو بہتر نتائج آ سکتے ہیں۔ بالخصوص خواتین کے لیے طویل مدتی تربیتی کورسس کا انعقاد عمل میں لایا جائے تا کہ ان کے ہنر میں اضافہ ہو اور وہ اپنا کام پورے اعتماد کے ساتھ انجام دے سکیں۔ اس مقصد کے حصول میں خود خواتین کو تساہل کی زندگی چھوڑ کر بڑا اہم اور فعال کردار ادا کرنا ہوگا۔ انہیں خاندان و سماج میں اپنے وجود کی اہمیت کو سمجھنا اور اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو سمجھانا ہوگا۔ آج مسلم خواتین کو صرف روایتی طرز پر تعلیم حاصل کرنے کی ہی ضرورت درپیش نہیں ہے بلکہ عصرِ حاضر کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اعلیٰ و پیشہ وارانہ تعلیم کے میدان میں آگے آئیں اور تکنیکی تربیت بھی حاصل کریں تا کہ انہیں روزگار سے جڑنے اور اپنی اور اپنے خاندان کی معاشی حیثیت کو بہتر بنانے میں آسانی ہو۔ جو خواتین گھریلو معیشت کے مختلف ذرائع سے وابستہ ہوئی ہیں انہیں جدید تقاضوں کے مطابق ہنر مندیوں اور اپنی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کی تربیت اور ان کے فروغ پر توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے تا کہ وہ اپنے کام اور محنت کی اجرت زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکیں۔ نیز ان کا کام ترقی کے مرکزی دھارے میں شامل ہو سکے۔

مسلم خواتین چونکہ بے شمار عائلی مسائل اور گھریلو تشدد سے متاثر ہیں اسی لیے ان کے لیے ایک باشعور فرد کی حیثیت سے اپنے شرعی و دستوری حقوق سے واقفیت حاصل کرنا لازم ہو گیا ہے۔ جس کے استعمال سے وہ اپنی نجی و سماجی زندگی باوقار انداز سے گذار سکتی ہیں۔ اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ خواتین کی تعلیم، ترقی و با اختیاری کے لیے دستیاب سرکاری سہولتوں اور وسائل تک ان کی پہنچ ہو اور وہ استفادہ کر پائیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے محلہ واری سطح پر زیادہ سے زیادہ شعور بیداری پروگرامس منعقد کیے جائیں۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے حکومت یا مذہبی و سماجی

تنظیموں کو ذمہ دار ٹھہرانے کے بجائے مسلم معاشرے کے زیادہ سے زیادہ مرد و خواتین کو اب میدانِ عمل میں آنا اور مختلف اقدامات کو اپنانا ناگزیر ہو گیا ہے تاکہ مسلم خواتین کی تعلیمی، سماجی، معاشی و صحّی پست حالت کو بہتر بنایا جا سکے اور ہندوستانی سماج میں ان کی مسخ شدہ شبیہ کو بہتر بنایا جا سکے۔ انہیں اس قابل بنایا جا سکے کہ وہ اپنے شرعی، دستوری و قانونی حقوق کا استعمال کرتے ہوئے، تعلیم یافتہ، ہنر مند، باصلاحیت، باشعور اور بااختیار سماجی فرد کی حیثیت سے ہندوستان میں باوقار زندگی گزار سکیں نیز بدلتے تقاضوں اور نئی تحدیات کا مقابلہ کرنے کی اہل ہو سکیں۔

DR AMNA TAHSEEN
Dept of Women Education
Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Email:amtahseen123@yahoo.com

ضمیر عصر حاضر بے نقاب ست
کشادش در نمود رنگ آب ست
جہاں تابی ز نور حق بیاموز
کہ او با صد تجلی در حجاب ست

”عصر حاضر کا ضمیر بے نقاب ہے۔ اس کا ظہور رنگ و آب اور سج دھج کا محتاج ہے۔ (لیکن مسلمان عورت کو) اپنے معاشرے اور دنیا کے حالات پر حجاب میں رہتے ہوئے اثر انداز ہونا چاہیے اور دنیا کو منور کرنا چاہیے جس طرح باری تعالی کی ذات حجاب میں ہے اور پوری کائنات پر اس کی تجلی پڑ رہی ہے۔“

(علامہ اقبالؒ، ارمغان حجاز فارسی)

مراجع و مصادر

1. Nayar.Usha. *"An Analytical Study of Education of Muslim Women and Girls in India*" .Ministry of Women and Child development.Delhi 2007،
2. Hasan .Z. & Menon R. 2004. *Unequal Citizens: A Study of Muslim Women in India*, Oxford University Press, New Delhi.
3. Kazi S. 1999. *Muslim Women in India*, A Report, Minority Rights Group International, London, UK.
4. GOI, 2006. *Social, Economic and Educational Status of the Muslim Community of India*, A Report, Prime Minister's High Level Committee, Cabinet Secretariat, Government of India (Chairperson-Justice Rajindar Sacher), New Delhi
5. Alam A. 2012. *Empowerment of Indian Muslims: Education is the key,* in M. A. Beg and A. R. Kidwai (eds.),*Empowerment of Indian Muslims: Perspectives, Planning and Road Ahead*, Concept Publishing Company Pvt. Ltd., New Delhi.
6. Shariff.A. 2016. *Institutionalizing Constitutional Rights: Post-Sachar Committee Scenario* ,New Delhi: Oxford University Press.
7. University Grant Commision,2011,*Higher Education in India,Strategies and Schemes during Eleventh Plan Period (2007-2012) for Universities and Colleges.New Delhi.*
8. Tahseen.A.2015 .*Mainstreaming the Indian Muslim Women-The Way forward.Ed.CWS.MANUU-Hyderabad*

نظر

سوشل میڈیا میں خواتین کی دعوتی وسماجی سرگرمی

نازآفرین

اسلام مرد اور عورت دونوں کو مساوی طور پر ایمان لانے اور اُس پر جم جانے کی دعوت دیتا ہے۔ ان پر اقامت دین کی انفرادی و اجتماعی ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ ایمان لانے، اس پر عمل کرنے تبلیغ و اشاعت اور اپنے رب کے حضور اعمال کی جواب دہی کے لیے دونوں برابر کے ذمہ دار ہیں۔ ان میں سے نہ کوئی ایک دوسرے کے لیے نجات کا باعث بن سکتے ہیں نہ ہی کسی کی خدمات کا حوالہ دے کر راہِ فرار حاصل کرنے کی گنجائش ہے۔ قرآن مجید میں دعوت کا لفظ انسانوں کو حق کی طرف، سچائی کے لیے، اللہ کی جانب بلانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ قرآن پاک کہتا ہے۔ ”اے نبی ﷺ اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔“ (النحل:25)

اس وقت سوشل میڈیا میں خواتین کی حصہ داری تقریباً مردوں کے برابر ہے۔ مختلف ممالک میں استعمال کنندگان کی تعداد مختلف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ چند مخصوص سائٹس پر خواتین زیادہ سرگرم ہیں۔ مثلاً فیس بک، انسٹاگرام اور یوٹیوب۔ سوشل میڈیا میں خواتین کی یہ سرگرمی کسی بڑی تبدیلی کی مثال بن سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا خواتین کی یہ فعالیت منظم اور با مقصد ہے؟ ان مقاصد کے کچھ بہتر نتائج سماج میں مرتب ہو رہے ہیں؟ سوشل میڈیا میں خواتین کی سرگرمی کتنی ضروری ہے؟ ویمن اینڈ ویب اسٹڈی کی رپورٹ کے مطابق جملہ 150 ملین انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں میں 60 ملین خواتین ہیں۔ اس تحریر میں خواتین کا رول کیا ہو؟ وہ کس طرح دعوتی کاموں کے لیے موجودہ دور میں میڈیا کا استعمال کرسکتی ہیں، اس حوالے سے گفتگو مقصود ہے۔ ان سوالات کے جواب تلاش کریں تو معلوم ہوتا ہے یہ دنیا نعمتوں سے بھری پڑی ہے۔ سوشل میڈیا کا استعمال بھی خواتین بطور نعمت ساری دنیا سے جڑنے کے لیے کرسکتی ہیں۔ سماجی تبدیلی میں خواتین کا رول ہمیشہ موثر ثابت ہوا ہے۔ اس لحاظ سے مسلم خواتین اور بالخصوص مسلم طالبات حالات حاضرہ سے استفادہ کرتے ہوئے سوشل میڈیا کو بہ طور پلیٹ فارم استعمال کرسکتی ہیں۔ وہ دعوتی، تعلیمی و سماجی خدمات انجام دیں۔ سوشل میڈیا نے گویا انسانی خدمات کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے۔ امریکہ میں ہر دس میں سے آٹھ افراد انٹرنیٹ کے ذریعہ شادی کر رہے ہیں۔ اسی طرح ہر دس میں سے پانچ طلاق کی وجہ بھی مختلف سائٹس پر نامحرموں سے بیجا تعلقات اور دوستی ہے۔ اگر مذکورہ اعداد و شمار اس طرح ہو جائیں کہ دس میں سے تین افراد سوشل میڈیا میں دی جانے والی دعوت دین کی وجہ سے اسلام قبول کر رہے ہیں اور یہ تعداد بڑھتی جائے تو اس کے زبردست نتائج سامنے آئیں گے۔ مسلم خواتین و طالبات فیس بک، ٹیوٹر اور انسٹاگرام وغیرہ میں خالصتاً دعوتی و سماجی تبدیلی کے اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لیے سرگرم رہ سکتی ہیں بشرطیکہ منصوبہ بند طریقے سے منظم انداز میں کام کریں۔ جو خواتین ان کاموں میں لگی ہوئی ہیں انہیں اس تعلق سے پوری حکمت عملی طے کرنے میں کلیدی اور فعال کردار ادا کرنا ہوگا۔ بعض دفعہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ سوشل

میڈیا میں اکاؤنٹ تو دعوتی و تنظیمی کاموں کے لیے بنایا گیا، بعد میں مقصد صرف تفریح ، پوسٹ شیئر کرنا اور فرینڈ لسٹ میں اضافہ کرنا رہ گیا۔ یہ اپنے وقت کے ضیاع کے ساتھ ساتھ دوسروں کے وقت کا بھی ضیاع ہے۔ ہمارے ذہن و دل میں اگر ہمہ دم یہ خیال غالب رہے کہ اپنے وقت کا حساب دینا ہے اپنے مال کی باز پرس ہونی ہے اور اپنے جسم کے استعمال پر سوال کیا جائے گا تو ممکن ہے خواتین بے مقصد کاموں سے اجتناب کریں۔ دراصل سماجی رابطے کی ان ویب سائٹس پر بہت محتاط ہو کر کام کرنے کی ضرورت ہے اور جب کوئی خاتون ہوں تب اور بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایک سروے کے مطابق اسمارٹ فون استعمال کرنے والے لڑکے یا لڑکیاں ایک دن میں کم از کم دو گھنٹے سوشل میڈیا میں صرف کرتے ہیں۔ یہ اوقات تبلیغ اسلام کے لیے استعمال ہو رہے ہیں تو قابل مبارکباد ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یاد رہے خدا کے حضور اپنے اچھے برے کاموں کا پورا پورا احساب دینا ہے۔ اللہ کے یہاں سخت باز پرس ہو سکتی ہے۔ ایسی خواتین جو سوشل میڈیا میں حد درجہ ایکٹیو ہیں، ان کی سرگرمی اسلامی، سماجی و تعلیمی نوعیت کی ہونی چاہیے۔ بلا ضرورت انٹرنیٹ سرفنگ مثلاً بلا تحقیق پوسٹ شیئر کرنا، تصاویر فارورڈ کرنا، لائک اور شیئر کا بٹن دبانا، ویڈیوز اور ہنسی مذاق کی چیزوں کو پھیلانا ایک داعی حق کے لیے نامناسب عمل ہے۔ اس کے برے اثرات ماتحتوں پر پڑتے ہیں۔ خواتین و طالبات اپنے بلند اور اعلی اخلاق سے وطنی بہنوں میں بہت اچھے اثرات مرتب کر سکتی ہیں۔ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں۔ اس وقت سوشل میڈیا کے توسط سے مسلم اور غیر مسلم دونوں میں اشاعت دین کی ضرورت ہے۔ اس کاز کے لیے خواتین کو کن محاذ پر اور کیسے دعوتی و سماجی خدمات انجام دینے ہیں اس کا گہرا شعور ناگزیر ہے۔

سوشل میڈیا میں خواتین کی فعالیت کی احتیاطی تدابیر اور سرگرمیاں

- سوشل میڈیا میں خواتین وطالبات کی موجودگی اہل خانہ کے علم میں ہونی چاہیے۔
- سوشل میڈیا اکاؤنٹ Create یا Open کرنے کے لیے اپنے ای میل کا استعمال کریں۔ ایک سے زائد ای میل وغیرہ سے بچنا چاہیے۔
- اکاؤنٹ بنانے کے دوران شخصی معلومات بقدر ضرورت ہی شیئر کریں۔
- دعوتی کام کا آغاز دوستوں اور رشتے داروں سے ہو۔
- میڈیا میں تمام قسم کی سرگرمیوں کے درمیان ہمارا مشن اور وژن دونوں واضح ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ دین کی اشاعت کی غرض سے میڈیا کا استعمال کرنے والی خواتین اور طالبات بے معنی تفریح کی اسیر ہو کر رہ جائیں اور اصل مشن فراموش ہو کر رہ جائے۔
- پہلے ہی اپنا ہدف طے کر لیں کہ میڈیا میں کب، کیسے اور کتنوں دنوں یا مہینے میں کتنی خواتین ولڑکیوں کے درمیان دعوت دین کا پیغام پہنچانا ہے۔ ایک وقت میں ایک ہی پلیٹ فارم پر دعوتی کوشش کی جائے۔
- جن خواتین سے دعوتی وسماجی ایشوز پر گفتگو ہو رہی ہے ان سے مستقل رابطے میں رہیں۔
- یہ بھی بہتر ہے کہ اپنے اکاؤنٹ میں محرم رشتوں کو شامل کریں، تاکہ محافظت کا تصور برقرار رہے۔
- سوشل میڈیا میں خواتین وطالبات کی سرگرمیاں صرف اللہ کے بندوں تک اللہ کے دین کو پہنچانے کی غرض سے ہوں۔

خواتین کے مختلف مسائل پر دنیا بھر میں مباحثے چل رہے ہیں۔ ان میں اسلام مخالف طاقتیں یہ باور کرانے کی پرزور کوششیں کر رہی ہیں کہ اسلام عورتوں کے ساتھ ظلم وناانصافی کرتا ہے۔ ایسے میں مسلم خواتین موقع کی مناسبت سے مدلل انداز میں اسلام کی عطا کردہ تمام تر عنایات، حقوق اور آزادی کا تصور پیش کر سکتی ہیں۔ اس کے لیے وہ خود اپنی ذات کو بھی بطور نمونہ پیش کر سکتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے صحیح اور مدلل انداز کے باوجود کسی کو غلط فہمی ہو جائے یا مخاطب کار بیہودہ اور ناگوار انداز اختیار کر لے۔ ان حالات میں بھی داعیات صبر تحمل اور حکمت سے کام لیں۔ بات بالکل بھی بنتی نظر نہ آئے تو ایسے لوگوں سے خاموشی کے ساتھ کنارہ کشی اختیار کر لیں۔

دعوت دین کے کام میں داعیات کے لیے ضروری ہے کہ ہندستان کے مختلف مذاہب سے واقفیت ہو۔ خاص طور سے ہندوازم، عیسائیت اور بدھ ازم کے لیے گہرا مطالعہ ناگزیر ہے۔ وقتاً فوقتاً اس موضوع پر مدلل انداز میں مباحثوں میں حصہ لیں۔ بین الاقوامی مذاہب کا تقابلی مطالعہ بھی سودمند ثابت ہوگا۔ جہیز، خدمت خلق، خودکشی، تعلیم کے مقاصد، خوبصورتی کا معیار، نکاح، طلاق، وراثت، جنین کشی، خواتین میں فیصلہ سازی کی سمجھ، گھریلو جارحیت اور عورتوں کے حقوق کے نفاذ کی صورتیں ایسے موضوعات ہیں جن پر مسلم خواتین کو ہر طرح سے کام کرنا چاہیے۔ اسلام کے حوالے سے غلط فہمیوں کی وجہ سے اکثر اس طرح کے سوالات پوچھتے ہیں۔ صرف اسلام کی ہی پیروی کیوں کی جائے؟ کیا اسلام تلوار سے پھیلا؟ کیا مسلمان کعبہ کو پوجتے ہیں؟ مسلمان گئو ہتیا (گوشت خوری) کیوں کرتے ہیں؟ مسلمان روایتی اور دقیانوس کیوں ہیں ؟مسلمان غنڈہ گردی کرتے ہیں؟ موت کے بعد کی زندگی کو کس نے دیکھا ہے؟ مسلم مرد ایک سے زیادہ یا چار شادیاں کیوں کرتے ہیں؟ چار شادی عورتوں پر ظلم ہے؟ پردہ عورتوں پر جبر کی علامت ہے؟ مسلمان فرقوں میں

کیوں بنٹے ہیں؟ کون سا فرقہ سب سے اچھا ہے؟ غیر مسلموں کو کعبہ میں داخلے کی اجازت کیوں نہیں ہے؟ آریہ سماجی کہتے ہیں: اللہ معاف کیوں کرتا ہے ۔کیا یہ انصاف کے خلاف نہیں ہے؟ عیسائیوں کے بیشتر سوالات قرآنی احکامات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہر نبی کی شریعت میں تبدیلی کیوں ہے؟ مسلمان دہشت گرد ہوتے ہیں؟ ایک اللہ کی پوجا کیوں کرتے ہیں؟

خواتین کے مختلف مسائل پر دنیا بھر میں مباحثے چل رہے ہیں۔ان میں اسلام مخالف طاقتیں یہ باور کرانے کی پرزور کوششیں کر رہی ہیں کہ اسلام عورتوں کے ساتھ ظلم و ناانصافی کرتا ہے۔ایسے میں مسلم خواتین موقع کی مناسبت سے مدلل انداز میں اسلام کی عطا کردہ تمام تر عنایات، حقوق اور آزادی کا تصور پیش کر سکتی ہیں۔اس کے لیے وہ خود اپنی ذات کو بھی بطور نمونہ پیش کر سکتی ہیں۔

یہ چند ایسے سوالات ہیں جن کے جواب داعیات کو معلوم ہونے چاہئیں۔ان میں سے کچھ کے جواب بروقت نہ دیئے جا سکیں تو احسن طریقے سے دوسرے وقت پر جواب دینے کی کوشش ہونی چاہئے۔اس ضمن میں اکاؤنٹ اکسیس سے پہلے کچھ تیاری کر لیں تا کہ سوال کرنے والی خواتین کے جواب ذہن میں محفوظ رہیں۔سوشل میڈیا میں دعوتی و سماجی خدمات کے لیے چند معروف خواتین سرگرم عمل ہیں۔ان سے واقفیت مفید ہوگی۔

- **ڈاکٹر فرحت ہاشمی:**

ڈاکٹر فرحت ہاشمی دعوتی و اصلاحی کاموں میں خواتین کے درمیان مسلسل کوشاں ہیں۔وہ اسلامیات میں پی ایچ ڈی ہیں اور انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی، اسلام آباد میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ان کے فالوورس کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ان کا یوٹیوب چینل خواتین کے درمیان سماجی و دینی بیداری کا باعث ہے۔وہ جدید ٹکنالوجی کا استعمال مثبت انداز میں کر رہی ہیں۔ان کی کوششوں سے خواتین وطالبات بہت کچھ سیکھ سکتی ہیں۔

- **ذکیہ بتول نجفی:**

ان کا تعلق بھی پاکستان سے ہے۔ان کا شمار بین الاقوامی سطح پر معروف اسلامی اسکالروں میں کیا جاتا ہے۔انہوں نے مجموعی طور پر خواتین کے ایشوز کو اپنا موضوع دلچسپی بنایا ہے۔اسلامی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے پوری دنیا میں اسلامی اقدار کو پیش کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ خواتین کے درمیان پائی جانے والی اوہام پرستی اور تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں کوشاں ہیں۔

- **عائشہ لیمو:**

1961 میں اسلام قبول کرنے کے بعد تبلیغ اسلام کو انہوں نے اپنا مشن بنالیا۔ اپنے شوہر کے ساتھ مل کر انہوں نے اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ، نائجیریا میں قائم کیا۔زمینی سطح پر کام، ان کی انفرادیت ہے۔عائشہ نے ایک داعیہ اور مصنفہ کی حیثیت سے تعلیم، تہذیب وثقافت اور اسلامیات پر درجنوں کتابیں لکھی ہیں اور خواتین کے درمیان کام کو اپنا ہدف بنایا۔مختلف مذاہب کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ میں انہیں عبور حاصل ہے۔

- **جمیلہ حنان:**

یہ برطانیہ کی ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے معروف ہیں۔انہوں نے انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف بڑے ہی منظم انداز میں ٹیوٹر پر مخالفت کی ہے۔مشرق وسطیٰ، فلسطین، بحرین، یمن اور میانمار میں ان کی کوششوں سے فنڈ اکٹھا کرنے میں کافی کامیابی ملی ہے۔انسانیت کو پامال ہونے سے بچانے میں اس خاتون نے بے خوف قدم اٹھائے ہیں اور کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہیں۔

- **منال الشریف:**

ان کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔یہ صحافی، مصنفہ اور سماجی کارکن کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں۔انہوں نے سعودی عرب میں خواتین پر کار ڈرائیو کرنے پر پابندی کی پرزور مخالفت کی۔جس وجہ سے حکومت نے انہیں قید بھی کیا، باوجود اس کے وہ اپنے موقف پر ڈٹی رہیں۔خواتین پر ظلم وتشدد کے خلاف آواز بلند کرنے میں ان کی کوششیں قابل ستائش ہیں۔

- **جنی جہاد تمیمی:**

اس تیرہ سالہ بچی کا تعلق فلسطین سے ہے۔اپنے خاندان والوں کو ہلاک کیے جانے پر اس نے اسرائیلی فوجیوں کے خلاف مورچہ کھول دیا۔اس دستاویز جمع کیے اور دنیا کے سامنے ان کے مظالم لائیں۔تمیمی اسرائیلیوں کے ظلم و بربریت کے ویڈیوز وغیرہ سوشل میڈیا میں اپلوڈ کرتی رہتی ہیں۔فی الوقت وہ فلسطین کی سب سے کم عمر صحافی مانی جاتی ہیں۔

NAAZ AAFREEN
Research Scholar
Ranchi University, Ranchi
Email:naaza55@gmail.com

حقوق نسواں کے نفاذ میں نوجوانوں کا رول

نویدالسحر

نوجوان طبقہ اپنی ہر حیثیت میں معاشرے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ خواتین کے تئیں نوجوانوں میں بیداری ناگزیر ہے۔ انسانی سماج وجودِ زن کے بغیر نا مکمل ہے۔ عالمی انسانی آبادی کا نصف حصہ خواتین پر مشتمل ہے۔ سماج کی تعمیر میں ان کا رول کتنا اہم ہے اسے ظاہر کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً یہ قول دہرایا جاتا ہے کہ: ''ایک عورت کی تعلیم کنبے کی تعلیم ہے اور مرد کی تعلیم صرف اس ایک مرد کی تعلیم ہے۔'' سماج کی تعمیر میں بے حد اہم کردار ادا کرنے والی عورت خود ہی مسلسل استحصال کا شکار اور حقوق سے محروم ہو تو ایسے سماج کی ترقی کسی طور ممکن نہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ تعلیمی اداروں، جائے ملازمت اور بازاروں میں خواتین کے تحفظ وسہولت کے لئے بنائے گئے قوانین سے متعلق بیداری لائی جائے۔

لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق گھر گھر میں بیداری لانا اور اپنی حدود میں متعلقہ خواتین کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں اس میدان میں آگے بڑھانا مسلم نوجوانوں کی ذمہ داری ہے۔ تعلیمی اداروں میں لڑکیوں کے لئے سہولیات اور تحفظ کی سرکار سے اپیل نوجوان تنظیموں کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔ مزید برآں لڑکیوں کے لئے مختلف طریقہ تعلیم کو متعارف کروایا جاسکتا ہے۔ خود خواتین کو اخبارات ورسائل کی ذمہ داری دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے۔ واضح ہو کہ ملک میں اس وقت اعلیٰ تعلیم میں مسلم خواتین کی تعداد 3٪ سے بھی کم ہے۔

نکاح، طلاق اور وراثت جیسے معاملات میں درستگی اور عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے شرعی عدالتوں کا ہر جگہ قیام ساتھ ہی قائم شدہ عدالتوں کا استحکام اور انہیں موثر بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ نوجوانوں کے لئے خود لازمی ہے کہ وہ عورتوں کے تئیں سلوکِ احسن کا مظاہرہ کریں اور معاملات کی مکمل اسلامی تعلیمات سے واقف ہوں اور ان پر عمل بجالائیں۔ گھر کے مختلف معاملات میں گھر کی خواتین سے بھی مشورہ لیں۔ اسی طرح نوجوان تنظیمیں معمولی اختلافات پر ٹوٹنے والے رشتوں کی کاؤنسلنگ کی کوشش کریں۔ جہیز کے ناسور کو ختم کرنے کے لئے خود نوجوانوں کو میدان میں آکر عملی اقدام کرنے ہوں گے۔ یہ سماج کے نوجوانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود جہیز کی مخالفت کریں اور نوجوان طبقہ میں اس سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کریں۔

خواتین کے حقوق کی پامالی

1۔ تعلیمی سطح پر: خواتین کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ اگر دینی چاہئے تو کیا اس کے کچھ حدود بھی ہیں؟ یہ مسئلہ آج بھی سماج کے کئی طبقوں میں موضوعِ بحث ہے۔ گو کہ گزشتہ چند دہائیوں میں سرکار، مختلف تنظیموں اور NGOs کی جانب سے اس سلسلہ میں بیداری کی سینکڑوں مہمات چلائی گئیں تاہم آج بھی اچھے خاصے افراد کا خیال ہے کہ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کرنا نقصاندہ ہے، کیوں کہ تعلیم یافتہ ہو کر وہ سوالات کرنے کے قابل ہو جائیں گی اور یوں معاشرہ کے بگاڑ کا سبب بنیں گی۔

2۔ معاشرتی سطح پر/ سماجی سطح پر: شادی میں رضامندی یا رائے کو شامل نہ کرنے سے لے کر معمولی اختلافات پر نکاح کو ختم کر دینا یا مدتوں اسے خلع نہ دے کر مجبور و بے بس کر دینا ہمارے معاشرے کی عام صورتحال ہے۔ گھریلو معاملات میں گھر کی خواتین سے مشاورت تو

دور کی بات انہیں صرف خادمہ سمجھ کر اسی انداز میں ان سے پیش آیا جاتا ہے۔ طلاق، وراثت جیسے معاملات میں دیگر مذاہب کے رسوم ورواج اور روایتیں قبول کر لی گئی ہیں جس کی وجہ سے خواتین ایک مستقل کرب میں مبتلا ہیں۔ جہیز گھریلو زندگی کا ہی ایک مسئلہ ہے لیکن سماج اس مسئلہ کا اس کثرت سے سامنا ہے کہ اب یہ مسئلہ ایک سماجی ناسور بن چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس سے جڑے کئی نئے مسائل بھی جنم لے رہے ہیں۔ جہیز کی لعنت نے نکاح کو مشکل بنا ہی دیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ نوجوانوں میں خوب صورتی کا معیار محض عارضی اور کھوکھلا ہے۔ جس کی وجہ سے لڑکیوں کی عزت نفس کو تکلیف پہنچ رہی ہے۔

3۔ تحفظ کا مسئلہ: ہندوستان میں سڑکوں، بازاروں، تعلیمی داروں، کمپنیوں وغیرہ جیسی ہر جگہ عورت کے ساتھ چھیڑ خانی اور جنسی زیادتی بڑھتی جارہی ہے۔ اس سلسلہ میں انہیں تحفظ فراہم کرنا انتہائی ضروری ہے۔ شرپسند عناصر حالات کو مزید پیچیدہ بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اب گھر اور تعلیمی اداروں میں بھی حفاظت کا تصور کم ہونے لگا ہے۔ ایسے میں بچیوں اور طالبات خود حفاظتی تدابیر اور ہنر سے آراستہ ہوں، یہ اہم ترین ضرورت بن گئی ہے۔ مخالفین کی نیت اور اہداف سے مسلم سماج بخوبی واقف ہے۔

عہد رسالت میں خواتین اپنے ساتھ ساتھ دوسری خواتین کی بھی حفاظت کرتی تھیں۔ ہمارے سامنے حضرت صفیہ ؓ اور حضرت اُمِ عمارہ ؓ کی روشن مثالیں موجود ہیں۔ جنھوں نے میدان جنگ میں مدافعانہ کردار ادا کیے۔ وہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے مضبوط تھیں۔ جدید دور میں بھی خواتین کے لیے ایسے انتظامات ناگزیر ہیں۔ مسلم خواتین میں اس وقت ایک ٹیم کافی اچھی کارکردگی انجام دے رہی ہے لیکن بعض ایسے مواقع ہیں جہاں مردوں کی رہنمائی اور تعاون ضروری ہے۔ جوڈو کراٹے اور ابتدائی طبی امداد وغیرہ کی ٹریننگ دی جائے۔ عورت کو جتنی ضرورت محبت کی ہے اس سے کہیں بڑھ کر وہ عزت وتکریم کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ حقوق وفرائض کی ادائیگی میں لازماً اس بات کا خیال رکھا جائے کہ عورتیں صرف بہن بیوی اور ماں نہیں ہیں بلکہ ان کا اپنا وجود ہے۔ وہ بھی انسان ہیں اور بہ حیثیت انسان انھیں تمام سہولیات ملنی چاہئیں جن کی اجازت اسلام دیتا ہے۔

مرد وعورت اللہ کی یکساں مخلوق ہیں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے ان میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ البتہ خلقی فرق کی بنیاد پر ان کی ذمہ داریوں اور دائرہ کار میں ضرور فرق ہوسکتا ہے۔ انسانی معاشرے میں ابتدا ہی سے اس فرق کو اپنی مرضی کے مطابق مفہوم کا لبادہ اوڑھا کر مرد کو عورت پر ترجیح دی گئی۔ مرد کو حاکم اور عورت کو محکوم مان لیا گیا۔ مسلم سماج کی صورتحال اس سے کچھ مختلف نہیں۔ یہاں صدیوں سے عورت پدرسری نظام (Patriarchal Society) میں اپنے بنیادی حقوق کے لئے لڑتی آئی ہے۔ مختلف مذاہب، اقوام اور ذاتوں سے قطع نظر مجموعی طور پر عورت کا ہر سطح پر استحصال ہوتا رہا ہے۔ اس کے حقوق پامال ہوتے رہے ہیں۔ دین دار گھرانوں میں بھی اس کی کئی مثالیں مشاہدے ہیں۔

اسلام وہ واحد دین ہے جس نے عورت کو اس کے مکمل حقوق فراہم کیے ہیں۔ اس کے تحفظ کا خیال رکھا۔ اسے عزت اور بلند مقام بخشا۔ لیکن صد حیف! ان حقوق کے نفاذ میں خود مسلم مردوں نے غفلت برتی۔ دیگر مذاہب کی ثقافت وروایات خود مسلم حلقوں میں معروف ہوگئیں۔ نتیجتاً حقوق کی جنگ میں آج مسلمان عورتیں بھی صف اول میں نظر آتی ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے فرمایا تھا:

''ہم مسلمان عورتوں کو بھی ضروری فوجی تعلیم دینے کا انتظام کریں گے اور یہ بھی انشاء اللہ اسلامی حدود کو باقی رکھتے ہوئے ہوگا۔ میں بارہا اپنے رفقا سے کہہ چکا ہوں کہ اب قومیت کی لڑائیاں حد سے بڑھ چکی ہیں اور انسان درندگی کی بدتر شکلیں اختیار کر رہا ہے۔ ہمارا سابقہ ایسی ظالم طاقتوں سے ہے جنھیں انسانیت کی کسی حد کو بھی پھاندنے میں تامل نہیں ہے۔ کل اگر خدانخواستہ کوئی جنگ پیش آجائے تو نہ معلوم کیا کیا درندگی اور وحشت ان سے صادر ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو مدافعت کے لئے تیار کریں اور ہر مسلمان عورت اپنی جان ومال اور آبرو کی حفاظت کرنے پر قادر ہو۔ انہیں اسلحہ کا استعمال سیکھنا چاہئے، وہ سواری کرسکتی ہوں سائیکل اور موٹر چلاسکیں، فسٹ ایڈ جانتی ہوں پھر صرف ذاتی حفاظت کی تیاری ہی نہ کریں بلکہ ضرورت ہو تو ہر قدم میں مردوں کا ہاتھ بٹاسکیں۔ ہم یہ سب کرنا چاہتے ہیں مگر اسلامی حدود کے اندر کرنا چاہتے ہیں ان حدود کو توڑ کر کرنا نہیں چاہتے۔ قدیم زمانے میں بھی مسلمان عورتوں نے اسلحے کے استعمال اور مدافعت کے فنون کی تربیت حاصل کی تھی۔ اسلامی حکومت میں عورتوں کو محض گڑیا بنا کر نہیں رکھا گیا جیسا کہ بعض نادانوں کا گماں ہے بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ ترقی کا موقع دیا گیا۔'' (دین اور دعوت، ص 18۔19)

خواتین کے حقوق سے متعلق مسائل کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں اولین ضرورت ''مسلم نوجوانوں میں بیداری''، ان کی ذہن سازی اور ان کی تعلیم وتربیت ہے۔ لہٰذا خواتین کے حقوق سے متعلق عوامی بیداری کے مختلف پروگراموں کا انعقاد کرنا اور اس موضوع پر علمی و فکری مضامین ومواد بھی تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

NAVED US SAHAR
Maulana Azad National Urdu University
Email:naveedussaher1234gmail.com

نظر

خواتین پر بڑھتے تشدد اور استحصال میں فلموں کا کردار

عمر فراہی

عورت کو ہماری کائنات کی ایک کمزور مخلوق شمار کیا جاتا ہے۔اسی لئے اسے عرف عام میں 'صنف نازک' بھی کہا جاتا ہے۔انسان کی فطرت میں جہاں قربانی کا جذبہ ودیعت کیا گیا ہے وہیں اس کی فطرت میں لالچ،مفاد اور ریاکاری بھی شامل کی گئی ہے۔اسی طرح انسان اپنی فطرت میں رحم اور صبر کی طاقت کے ساتھ ساتھ تشدد،شہوت اور برائی کی خواہشات بھی رکھتا ہے۔

خالق انسان نے انسان کو اپنے نفس اور جذبات پر قابو رکھنے کیلئے انفرادی طاقت اور اختیار بھی دیا ہے۔اس طرح انسان کے اپنے نفس پر جو جذبات غالب آتے ہیں وہ اس پر عمل کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔قرآن میں ہے کہ تم میں ہر ایک کا اپنا رخ ہے۔پس تم خیر کی طرف سبقت حاصل کرو۔یہی مشیت ایزدی اور اللہ کا امتحان ہے۔انسان کو اختیار ہے وہ چاہے جو راستہ پسند کرے۔اس کے علاوہ مشیت ایزدی کے فیصلے میں انسانوں کے درمیان ابلیس کی موجودگی بھی کسی فتنے سے کم نہیں ہے۔ابلیس ایک اسلام مخالف نظریہ ہے اور وہ کسی صورت نہیں چاہے گا کہ دنیا میں اسلام غالب ہو۔ابلیس کو بھی پتہ ہے کہ مردوں کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے۔خود عورت کی کمزوری فیشن اور شوق وسنگار ہے۔عورت جب تک ایک مشترکہ سماج اور معاشرے کے حصار میں ہوتی ہے اس کی حیاء اور عزت وآبرو بھی محفوظ رہتی ہے مگر جب وہ گھر،حجاب اور معاشرے کے بندھن سے آزاد ہوکر آزادانہ باہر قدم رکھتی ہے تو شیطان اس پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔اس کی یہ بے پردگی جہاں اسے غیر محفوظ کر دیتی ہے اس کے شوق وسنگار سے مردوں کی نظروں کا خراب ہونا بھی لازمی ہے۔اس طرح ابلیس اور ابلیسی طاقتیں عورت اور مرد کی اس کمزوری کے راستے سے ایک پورے معاشرے کو گندہ کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔موجودہ فلم انڈسٹری ہو یا سیریل یہ تمام

اداروں میں بے تحاشہ اضافہ کرنے کا ہی ایک خوبصورت طریقہ ہے۔ لوگوں کو اس طرف راغب کرنے کیلئے اسے تجارت جیسے پرکشش پیشے میں تبدیل کردیا گیا ہے بھی۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس راستے سے سماج کے ہر طبقے کی اپنی خواہش پوری بھی ہو جائے۔ لیکن تفریح کی یہ صنعت اتنی خوشنما اور پرکشش ہے کہ سماج کا ہر طبقہ اس طرف ذہن اور دولت کو لگانے کے لیے آمادہ ہے۔ ادارے فیشن، فحاشی، گلیمر اور عریانیت کے ذریعے مرد و زن کی خواہشات

لیکن یہ بھی ہے کہ ہمارا سماج کئی طبقات میں منقسم ہے اور ہر سماج کی معاشرتی زندگی بھی اس کے اپنے معاشی حالات کے وجہ سے مختلف ہے۔ خاص طور سے فلموں اور سیریلوں میں جو مناظر دکھائے جاتے ہیں یا جس طرح سے خوبصورت دوشیزاؤں کو میک اپ اور سنگار میں رقص و سرور میں بتایا جاتا ہے یہ معاشرہ صرف اونچے گھرانوں سے ہی تعلق رکھتا ہے یا محلوں میں فلمائی جانے والی تقریباً تمام کہانیاں امیر کبیر گھرانوں کی ہی تصویر پیش کر رہی ہوتی ہیں۔ یہ بھی کہہ لیں کہ اکثر امیر گھرانوں میں بھی یہ معاشرہ ایسے اونچے گھرانے والوں کا ہوتا ہے جہاں کچن بھی نوکرانیاں سنبھالتی ہوں اور جہاں پردے کا کلچر ل تو دور کی بات ہے، عورتوں کے دیگر مردوں کے ساتھ گھومنے پھرنے یا دوستی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوتا اور یہاں عورت مرد کاروباری اداروں میں ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔

غور کیجئے کہ ایک ایسی تصویر جو ایک خاص طبقے سے تعلق رکھتی ہو اور اسے فلموں اور سیریلوں کے ذریعے عام معاشرے میں پیش کی جائے گی تو کیا اس کے منفی اثرات سماج کے دیگر طبقات پر نہیں پڑیں گے؟ کیا اس سماج کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جن کی اپنی بھی خواہشات ہیں اسے پوری کرنے کی کوشش نہیں کریں گے؟ جہاں عورتیں خوب صورت نظر آنے کے لیے اپنے مردوں سے شوق و سنگار اور اچھے گھر کی متمنی ہوتی ہیں مرد بھی چاہتا ہے کہ اسے خوبصورت عورت ملے اور وہ ہمیشہ خوبصورت دکھائی دے۔ لیکن ایک ایسے سماج میں جہاں ٹھیک سے روٹی اور کپڑے کا بندوبست ہونا ممکن نہیں ہوتا، جہاں ٹھیک سے سر چھپانے کیلئے دو کمرے کا مکان مشکل سے حاصل ہو، جہاں عورت کو پورا دن ساس سسر کی خدمت اور بچوں کی پرورش سے فرصت نہ ملے، وہ اپنے مرد کی خواہشات کے لیے میک اپ اور سنگار کیسے کر سکتی ہے۔ لیکن ایسے پسماندہ گھرانوں کے مرد بھی جو فلموں اور سیریلوں کو دیکھ کر اپنے ذہن کو خراب کر لیتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان کی اپنی بیویاں بھی اسی طرح خوبصورت دکھائی دیں اور خود عورت بھی چاہتی ہے کہ اس کا بھی ایسا ہی خوبصورت گھر ہو اور پیار کرنے والا شوہر ہو۔ بدقسمتی سے پسماندہ اور غریب گھرانے کے مرد و خواتین کی جب یہ خواہش پوری نہیں ہو پاتی تو آپس میں تکرار شروع ہو جاتی ہے اور نوبت مار پیٹ اور تشدد تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی ذہنی انتشار اور تشدد سے پریشان جہاں کچھ نوجوان شراب پینا شروع کر دیتے ہیں آزاد خیال عورتیں بھی یا جہاں دین مذہب اور سماج کا کوئی دباؤ نہیں ہوتا، آزادانہ مردوں کے ساتھ اپنی اپنی روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے باہر نکل جاتی ہیں۔ بظاہر عورت اپنی گھریلو ضروریات کیلئے باہر تو نکلتی ہے لیکن اسے یہ نہیں پتہ ہوتا ہے کہ انسانوں میں بھی حیوان نما جانور ہوتے ہیں جو عورت کے جسم کے بھوکے ہوتے ہیں۔ اکثر کمرشیل اداروں میں جہاں پرکشش تنخواہوں کے ذریعے عورت کا استحصال ہوتا ہے کہیں عورت خود سے اور کہیں اپنے خوبصورت مستقبل کے جھانسے میں اس استحصالی دنیا کا استعمال ہو جاتی ہے۔ حال میں '# می ٹو' تحریک نے ہمارے استحصالی سماج کی اسی تصویر کو بے نقاب کیا ہے۔ ●

نظر

سیکس کا بازاری کَرن اور خواتین

ڈاکٹر جاوید جمیل

گزشتہ چند سالوں میں ہندوستان میں عدالت عظمیٰ کی طرف سے جو فیصلے آئے ہیں اور جو تحریکیں منظر عام پر آئی ہیں انہیں دیکھ کر یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اب ہندوستان بھی اسی گلوبل جنسی انقلاب کی زد میں آچکا ہے جسے انقلاب کہنا بھی اس لفظ کی توہین ہے۔ یہ نام نہاد انقلاب دراصل ایک طوفان تباہی ہے، جس کے نتائج جسمانی اور سماجی سطح پر انتہائی خطرناک ثابت ہو چکے ہیں۔ انقلاب ایسی تبدیلی کا نام ہے جو مفید ہو مگر ہر تبدیلی مفید نہیں ہوتی۔ جنسی انقلاب کوئی دوا نہیں ہے جو امراض کا علاج کرے بلکہ یہ ایسا نشہ ہے جس میں تباہی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس ''انقلاب'' نے افراد کے وجود ہی کو داؤ پر لگا دیا ہے، خاندان کی جڑیں اکھاڑ دی ہیں اور سماج کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس نے افراد کو صحیح راستے سے گمراہ کر دیا ہے، ہر سماجی تنظیم کا قلعہ قمع کر دیا ہے اور ترقی کی شبیہ خراب کر دی ہے۔ اس نے اگر کسی کو مالا مال کیا ہے تو وہ انسانی کمزوریوں اور ہوس کے سوداگر ہیں۔ اس نے لفظ انسانیت کو بے معنی کر دیا ہے اور انسان اور حیوان کے بیچ کی دیوار کو انتہائی مہین کر دیا ہے۔ اس نے دیرپا سکون کو وقتی لطف کی سولی پر چڑھا دیا ہے۔ اس نے صحت کو دولت کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس نے ضمیر کے پیٹ میں چھرا گھونپ کر کردار نام کی چیز کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ اس نے بچپن کو زخمی کر دیا ہے، نسوانیت کا گلا گھونٹ دیا ہے اور آدمیت کو حیوانیت کا چولا پہنا دیا ہے۔ اس نے عورت کے دامن سے حیا کو اتار کر پھینک دیا ہے اور اس کو عریانیت اور بے شرمی کے چولوں میں ملبوس کر دیا ہے۔ اس نے مرد کو عورت کے محافظ کے بجائے حسن زن کا لٹیرا بنا چھوڑا ہے۔ اس نے محبت کے بغیر جنسی عمل (Sex) کو فطری اور سیکس کے بغیر محبت کو غیر فطری قرار دے دیا ہے اور سیکس کے لئے ہر پابندی اور رکاوٹ کو ہٹا دیا ہے۔ اب نہ یہ شرط ضروری ہے کہ شادی کی جائے، نہ یہ کہ مرد اور عورت ہوں، مرد مرد سے اور عورت عورت سے رشتہ قائم کرنے کے لئے 'آزاد' ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ دونوں راضی ہوں۔ اور اگر آپ طاقتور ہیں اور قانونی داؤ پیچ کی سمجھ رکھتے ہیں تو رضامندی بھی لازمی نہیں۔ اب اس کے لئے خلوت بھی درکار نہیں، محفلوں میں لوگوں کے سامنے بھی جنسی عمل کو انجام دیا جاسکتا ہے محض چند نام نہاد شرائط کے ساتھ۔ اس نے والدین اور بچوں کے درمیان مقدس رشتے کو بھی پوری طرح درہم برہم کر دیا ہے۔ غرض یہ کہ محبّت پوری طرح ہوس میں تبدیل ہوگئی ہے۔

سیکس کی تجارت اور اس کے نتیجے کے طور پر جس قسم کا کلچر پروان چڑھتا جا رہا ہے نتیجہ یہ ہے کہ ہر قسم کے جرائم میں تیز رفتاری کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ قتل، زنا بالجبر، جنسی بدسلوکی اور مختلف طریقوں سے استحصال اور جسم فروشی اتنی عام ہوتی جا رہی ہے کہ اب ان خبروں سے کوئی حیران بھی نہی ہوتا۔ ظاہر ہے یہ تمام مسائل ان ممالک میں کہیں زیادہ ہیں جہاں پر مغربی قوانین اور خدا بیزار تہذیب اپنا جال پھیلا رہی ہے۔ مختلف ذرائع سے سیکس کی تجارت یا یہ کہیے کہ سیکس کے کمرشیلائزیشن نے سب بڑا جرم یہ کیا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ پھر عورت کو محض ایک جنسی شئے (Sex Commodity) بنا کر رکھ دیا ہے جس کا وجود صرف اس لیے ہے کہ وہ مرد کی جنسی بھوک کی تسکین کا سامان فراہم کر سکے۔ اس کمرشیلائزیشن کا نتیجہ یہ ہیے کہ اب تعلیم یافتہ اور ناخواندہ مردوں کی اکثریت حتی کہ نوعمر لڑکے بھی عورت کے حوالے سے یہی تصور رکھتے ہیں اور عورت کو اسی بیمار زدہ ذہنیت سے دیکھتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے مطابق کم و بیش 12 کروڑ خواتین اپنی زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ زنا بالجبر کا شکار ہوتی ہیں۔ 25 لاکھ سے زیادہ خواتین ہر سال زنا بالجبر کا شکار ہوتی ہیں۔ امریکہ میں ہر تیسری عورت کے ساتھ زبرستی زنا کی کوشش ہو چکی ہے۔ حد یہ ہے کہ اب ہم جنس پرستوں کے مابین بھی زنا بالجبر بھی عام ہوتا جا رہا ہے۔ زنا بالجبر کے اکثر واقعات میں مرد نشے کی حالت میں ہوتا ہے یا خاتون کو دھوکے سے نشے میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ زنا کے عام ہونے اور بالخصوص ہم

جنسیت کے پروان چڑھنے کی وجہ سے کئی لاکھ لوگ ایڈز کا شکار ہو چکے ہیں ۔پچھلے 25 سال میں 02 کروڑ سے زیادہ افراد ایڈز کے سبب موت کا شکار ہو چکے ہیں۔ زنا کے عام ہونے کی وجہ سے ہی ہر سال 05 کروڑ سے زیادہ بچوں کا ان کی ماں کے پیٹ میں ہی قتل کر دیا جاتا ہے۔ یہ اعداد و شمار انتہائی بھیانک ہیں مگر اقتصادی قوتوں کا غلبہ اس قدر ہے کہ ان پر گفتگو بمشکل ہی کی جاتی ہے۔

اگر خواتین کے خلاف تشدد میں اضافہ ہو رہا ہے تو اس کی کئی اہم وجوہات ہیں۔ انہیں آزادی کا جھانسہ دے کر غیر محفوظ بنا دیا گیا ہے۔ ان کا بیشتر وقت گھر کی محفوظ دیواروں سے باہر گزرتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان پر حملوں کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ دوسری سب سے بڑی وجہ بے قید اختلاط مرد و زن اور نیم عریاں فیشن پر مبنی وہ ماحول ہے جو انسان کے جنسی جذبات کو اکساتا ہے۔ خواہ میڈیا ہو یا فلمیں اس قسم کے اکثر ادارے جنسی ہیجان پیدا کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ ایسے حالات میں کچھ سرپھرے مردوں کے لیے امکان پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر جب قوانین بھی لچر ہوں اور سزا پانے کے امکانات بھی حد درجہ کم ہوں تو شادی کے بعد یا شادی سے پہلے ناجائز جنسی تعلقات کا قائم ہونا بھی ممکن ہے اور جنسی تشدد کا بڑھنا بھی لازم ہے۔ انسانی کمزوریوں کے سوداگروں نے آزادی پسندی کے نام پر جس طرح کا ماحول پیدا کیا ہے اس حقیقت کو بیان کرنا بھی طبع ہائے نازک پر گراں گزرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی انہیں بیان کرے اور ان پر تنقید کرے تو اسے مورل پولیسنگ (Moral Policing) کہہ کر اس مذاق اڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ایک طرف یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ ہم اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں جو سائنس اور تکنالوجی کا دور ہے اور دوسری طرف ہم ایسا آئینی نظام تیار کر رہے ہیں جو انسانی زندگی اور صحت کے لیے سائنسی طور پر بھی مضر و مہلک ہے۔ اگر سائنسی حقائق کی روشنی میں جدید تہذیب کا تجزیہ کیا جائے تو یہ ایک ایسے نظام کے طور پر سامنے آتی ہے جسے تہذیب کہنا بھی تہذیب لفظ کی حرمت کے منافی ہے۔ یہ درحقیقت ایک وحشیانہ نظام ہے جس میں ایسے تمام افعال کی ترغیب اور اجازت دی جاتی ہے جو انسانی زندگی کی بقا اور اس کی تندرستی کے لئے انتہائی مضر ہیں۔ طب اور سماجیات سے متعلق اعداد و شمار چیخ چیخ کر بتا رہے ہیں کہ شراب نوشی، ہم جنسیت اور آزادانہ جنسی اختلاط ہر برس لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کو لقمۂ اجل بناتے ہیں۔ لیکن چوں کی اس تہذیب سے سیکڑوں ملٹی نیشنل کمپنیوں اور انڈسٹریز کے معاشی مفاد وابستہ ہیں اس لیے کروڑوں انسانی جان کی کوئی قیمت تسلیم نہیں کی جاتی۔ کاروبار جاری رہنا چاہیے خواہ اس کی قیمت کسی بھی صورت میں چکانی پڑے۔

آزادی، مساوات، ترقی اور جدیدیت وغیرہ یہ چند بظاہر دلکش نعرے دراصل سوداگران عیش و ہوس کے ہاتھ میں مرد و خواتین کا استحصال کرنے اور انسانی کمزوریوں کی تجارت کے لئے سب سے موثر ہتھیار بن گئے ہیں۔ انسانی کمزوریاں اب choices بن گئی ہیں اور سپریم کورٹ اور آئین پر بھی ان کا احترام لازمی ہو گیا ہے۔ باہمی تضاد کی انتہا دیکھیے کہ جو لوگ جان کے حقوق کے نام پر سنگین قاتلوں کو بھی پھانسی دئے جانے کی مخالفت کرتے ہیں وہ ایسے کاروبار کی اجازت مانگتے ہیں جن کے نتیجے کے طور پر لاکھوں اموات ہوتی ہیں۔ وہ ان کروڑوں بچوں کے لئے کبھی آواز نہیں اٹھاتے جنہیں ہر سال ماں کے پیٹ میں قتل کر دیا جاتا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ خاندانی نظام مکمل طور پر درہم برہم ہو گیا ہے۔ شادی شدہ مرد اور عورتوں کے ناجائز جنسی تعلقات اور ہم جنسیت کو جرم نہ قرار دینے کے سپریم کورٹ کے فیصلوں کے بعد ہندوستان بھی جنسی اباحیت کے اسی مقام بربادی کی جانب تیزی سے گامزن ہو گیا ہے جہاں مغربی ممالک پہلے سے کھڑے ہیں۔ امریکہ میں 18 سال کی عمر ہونے سے پہلے پہلے کثیر تعداد میں لڑکیاں اسقاط حمل کرا چکی ہوتی ہیں۔ نصف سے زیادہ بچے شادی کے بعد ناجائز جنسی رشتوں کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ 50 فی صد سے زیادہ بچے یا تو صرف ماں کے ساتھ رہتے ہیں یا صرف باپ کے ساتھ۔ پوری دنیا میں ہر سال کم و بیش 05 کروڑ بچے اسقاط حمل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کروڑوں خواتین جسم فروشی کے کاروبار میں ملوث ہیں۔ صرف ہندوستان میں ہی یہ تعداد 01 کروڑ سے زیادہ ہے۔ پچھلے 25 سالوں میں 04 کروڑ سے زیادہ انسان ایڈز کے ہاتھوں موت کا شکار ہو چکے ہیں۔ شراب ہر سال 30 لاکھ سے زیادہ لوگوں کی جان لے لیتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ لوگ نشے کی حالت میں گاڑی چلانے کی وجہ سے یا نشے کی حالت میں قتل کرنے کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ ہم جنسیت بھی جنسی امراض اور ان کے ذریعے ہونے والی اموات کا ایک بہت بڑا سبب بن چکی ہے۔ اعداد و شمار کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم جنسیت کے شکار لوگوں کی اوسط عمر دوسروں کے مقابلے میں 20 سال سے 30 سال تک کم ہوتی ہے۔

یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ اگر انسانی زندگی کی بقاء اہم ہے تو اس کی ضمانت ایک مضبوط خاندانی نظام ہے۔ اور اگر خاندانی نظام کو مضبوط کرنا ہے تو ان تمام طور طریقوں کے خلاف مہم چلانی پڑے گی جو صحت اور خاندانی نظام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ ایک مہذب سماج میں شراب، ہم جنسیت اور آزادانہ جنسی اختلاط کے لئے کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ اگر کوئی ان کی وکالت کرتا ہے تو وہ انسانیت اور مہذب سماج کا دوست نہیں بلکہ دشمن ہے۔ اگر ان کے خلاف سماجی اور قانونی اقدامات کیے جائیں تو یہ انسانیت کی بڑی خدمت ہوگی۔

خواتین کی ہراسانی، تشدّد و عدم تحفظ: کیا کوئی حل بھی ہے؟

ڈاکٹر ریحان انصاری

8 ستمبر 2018 کے دن یوایس اوپن ٹورنامنٹ کے فائنل مقابلہ میں ٹینس اسٹار سیرینا ولیمز نے اپنی شکست پر جو حرکت ردِّعمل ظاہر کیا وہ متوجہ کرنے کے قابل تھا۔ اس نے ریفری کے ساتھ جو بھی بدزبانی یا غصہ کا معاملہ کیا وہ میڈیا کے ذریعہ افشا کیا گیا۔ ہمیں اس کی تفصیلات میں نہیں جانا ہے۔ نہ یہاں ہمیں اس بات سے کوئی سروکار ہے کہ کون حق پر ہے اور کون ظالم؟ لیکن ایک بات جو بہت زیادہ اچھالی گئی وہ سیرینا ولیمز کا وہ احتجاجی جملہ ہے کہ دورانِ مقابلہ اشاروں کنایوں میں اسے جنسی ہراسانی اور نسلی تعصب کا شکار بنایا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ایک ایسے ملک میں جو جنسی تفریق کے خلاف اور یکساں حقوقِ مرد و زن کا خودساختہ علمبردار ہو، وہاں ابھی تک عوام کی تربیت نہیں ہوسکی؟ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دنیا میں خواہ کتنے ہی نام نہاد اصلاحی قوانین وضوابط بنالیے جائیں خواتین کی ایذا، ہراسانی اور عدم تحفظ میں کمی نہیں ہوسکتی ۔کیوں کہ ہر بننے والا قانون یا اصلاح ایک غلط نیت اور مقصد (یعنی مفاسد و مفاد) کی بنیاد پر ہوتا ہے اور اس کی بنیاد میں ایک ہی اصول ہوتا ہے کہ خواتین کو خوشنما (نفسیاتی) فریب اور ’غیر فطری‘ خوداعتمادی کا نشہ پلا کر ان کا (جسمانی ونفسیاتی) استحصال کیا جاتا رہے۔ سیرینا ولیمز تو اس عالم گیر فریب کا ایک ذیلی اور معمولی عنوان ہے۔ ماضی اور حال کے ہر صفحہ پر روزانہ ایسے مظالم اور حقوقِ نسواں پر ڈاکہ زنی لکھی جارہی ہے۔ شماریات (Statistics) لکھنے والے اس کے اعداد و شمار کا ڈیٹا مکمل کر ہی نہیں پاتے۔ ہمیں بھی اس مضمون میں انہیں پیش کر کے وقت کا ضیاع نہیں کرنا ہے۔ کیوں کہ یہ ہر ایسی ویب سائٹ پر بیش و کم مل ہی جائے گا جو اس سے متعلق ہوگی۔ دلچسپی رکھنے والے قارئین لاگ اِن کر سکتے ہیں۔ ہم اس کے خلاصے کے طور پر اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ملکوں ملکوں کی اپنی کہانی ہے۔ یہ تعداد کسی ایک ملک میں سالانہ ہزاروں میں تو کہیں لاکھوں میں ہے اور یومیہ بھی چند سیکنڈ میں ایک عورت طرح طرح کے استحصال کا شکار ہوتی ہے۔ آخر اس کے اسباب کیا ہیں؟

دنیا میں بے شمار مخلوقات ہیں۔ معلوم بھی اور نامعلوم بھی۔ ہر مخلوق کو اللہ نے جوڑا جوڑا پیدا فرمایا ہے (سورۃ الذاریات، آیت 49)۔ کسی مخلوق کا کہیں بھی کوئی نمایاں مسئلہ نہیں ہے۔ اگر مسئلہ ہے تو حضرتِ انسان کا اپنے جوڑے کے ساتھ ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ایسا کب سے شروع ہوا۔ لیکن اس سلسلہ مسائل میں (معمولی سے فیصد سے صرفِ نظر کریں تو) عورت ہی کو

ایذا کا نشانہ بنایا جا تا رہا ہے؛ خواہ اسے ایذا امراد پہنچا رہے ہوں یا خود ایک عورت اپنی ہم جنس کے لیے سبب ایذا بنی ہو۔ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ کوکھ سے لے کف ضعیف العمری اور قرب مرگ تک (چند استثنائی فیصد کو چھوڑ دیا جائے تو) اسے سکون ملنا محال دکھائی دیتا ہے۔

بغور دیکھا جائے تو یہ سارا کھیل نفس کا ہے۔ نفس جو انسانوں کو دیا گیا ہے۔ مردوں کو بھی عورتوں کو بھی۔ لیکن مرد انفرادی بھی اور اجتماعی سوسائٹی میں بھی عورتوں پر ہر دور میں استحصالی معاملہ کرتا آیا ہے۔ عورتوں کے مسائل پر اس (غیر اسلامی) دنیا نے صرف انیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی کے بعد ہی یہ 'باتیں' کرنا شروع کیا ہے۔ ان باتوں میں ترجیح جن مسائل کو حاصل ہے وہ ''عورتوں کے حقوق، اختیارات (امپاورمنٹ)، آزادی، ترقی'' جیسے دلکش عنوانات ہیں۔ ایک صدی قبل جب ان حقوق پر غور کیا جانے لگا تو ان حقوق کے لیے آواز اٹھانے والی عورتوں کو جو مظالم سہنے پڑے انھیں پڑھیے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ جدید دور کے مرد بھی کتنے ظالم ہیں۔ یعنی انہیں آسانی سے یہ حقوق ملے بھی نہیں۔ پھر ان کے قریب کا درجہ سوچیے کہ ان میں کہیں بھی کسی بھی موقع پر ''عورتوں کو انصاف'' کا عنوان نہیں ملتا۔ اس کے مقابل (قدیم یا نئی) اسلامی دنیا میں (خواہ وہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں یا دیگر)؛ آپ کو عورتوں کے ساتھ چند استثنیٰ کو چھوڑ دیا جائے تو گزشتہ پندرہ صدیوں سے ''پورا پورا انصاف'' دیا جا تا رہا ہے۔ لیکن دنیا کا میڈیا چونکہ یورپی اور دیگر مغربی بڑی طاقتوں کے قبضہ میں ہے؛ چنانچہ اسلامی مملکتوں یا ممالک کو عورتوں پر جبر و استبداد تھوپنے والا مشہور کرتا رہا ہے۔ اس کا واضح سبب یہ رہا ہے کہ میڈیا میں اسلامی ممالک کی عورتوں کی چیخ و پکار نظر نہیں آتی، انہیں سڑکوں، ریستورانوں اور دفاتر اور دیگر عوامی خدمات میں عورتیں برسرِ روزگار دکھائی نہیں دیتیں، وہاں کے میڈیا میں کبھی عورت کا چہرہ نظر بھی آ گیا تو باقی بدن با حجاب ہوتا ہے۔ ان کے لیے مخلوط تعلیم ممنوع ہے، تفریح اور تفریحی مقامات پر بھی لالچی نظروں کو عورتوں کو اپنی نیت (ہوس) کے حساب سے دیدار نصیب نہیں ہوتا۔ یہ سب باتیں دنیا کے دھرمندر میڈیا کی نظروں میں دقیانوسیت، عورتوں پر جبر و استبداد اور ان کے حقوق سلب کرنے سے نسبت رکھتی ہیں۔ اس میڈیا نے کبھی اپنی خاتون نمائندوں کی ٹیم سے یہ جائزہ حاصل کرنے کی وسیع تر کوشش نہیں کی کہ آخر ان کی عورتوں کا درونِ خانہ اصلی حال واحوال کیسا ہے؟ کیا واقعی ان کے ساتھ وہی سب کچھ ہوتا ہے جو اس نے فرض کر رکھا ہے؟ بی بی سی اردو ڈاٹ کام، لندن، کی صحافی قندیل شام اپنے مضمون ''حقوقِ نسواں: وہ منزل ابھی نہیں آئی'' میں لکھتی ہیں: ''ورلڈ اکنامک فورم 'صنفی امتیاز' کو بنیادی طور پر چار حوالوں سے جانچتا ہے۔ ان میں شامل ہیں: 1) معاشی شراکت داری اور مواقع، روزگار میں عورتوں کی نمائندگی، تنخواہوں میں مساوات، عورتوں کی آمدنی کا تخمینہ، قانون ساز اسمبلیوں میں خواتین کا تناسب، اعلیٰ سرکاری افسروں میں خواتین کا تناسب اور پیشہ ورانہ ماہرین اور تکنیکی ورکروں میں خواتین کا تناسب، 2) تعلیمی صورتحال، خواتین کی شرح خواندگی، اور پرائمری، سیکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں خواتین کے داخلے کی شرح، 3) صحت اور حق حیات، بچوں کی پیدائش میں لڑکیوں اور لڑکوں کا تناسب اور صحت مند شرح عمر کا تخمینہ، 4) سیاسی اختیار، ارلیمنٹ میں عورتوں کا تناسب، وزارتوں میں عورتوں کا تناسب اور عورت سربراہ مملکت کے اقتدار کا دورانیہ''

ان چاروں نکات پر غور کریں تو اس میں واضح نظر آتا ہے کہ کل ملا کر آنکھوں پر عینک صرف 'ایکانومی' (Economy) کی ہی چڑھی ہوئی ہے۔ ہر ترقی اور حق کو معاشی مسئلہ سے جوڑ دیا گیا ہے۔ کوئی دوسری قدر مطلوب نہیں ہے۔ ہم یقیناً نئی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہمارا یہ نیا دور کچھ تقاضے کرتا ہے اور ہم بھی اس کے حامی ہیں کہ آج کی دنیا میں عورتوں کا معاشی پہلو قطعی کمزور نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ان کے مجموعی تحفظ میں ایک بڑا رول ادا کرتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی جن عورتوں کو یہ حقوق حاصل ہو چکے ہیں وہاں صورتحال تبدیل ہو گئی ہے یا صرف واقعات کے حالات بدل گئے ہیں؟ ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ دنیا کے تمام مرد یکساں صلاحیت نہیں رکھتے اور عورتیں تو بہت ساری صلاحیتوں کی متحمل بھی نہیں ہوتیں! تو بھلا کیسے اور کن کن امکانات میں صنفی یکسانیت پیدا ہو سکتی ہے؟

یہ سبھی مسائل اور معاملات اسی لیے ہیں کہ ان کو فطرت سے زیادہ عقل پر اور عقل سے زیادہ اغراض اور نیتوں پر محمول کر کے بنایا جاتا ہے۔ عورت کے وجود کو مرد کے مثل سمجھا جاتا ہے۔ اس کو بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ ''وہ مردوں سے کم نہیں ہے''۔ یہ جملہ ہی اس کی کمزوری بن جاتا ہے۔ اسے اپنے فطری وجود کے تقاضے تو پورے کرنے ہی پڑتے ہیں، اس پر 'مردوں کے مانند' ذمہ داریوں کا بوجھ مزید بڑھ جاتا ہے۔ یہیں سے اس کی بے چارگی شروع ہوتی ہے اور جوں جوں دوا کی جاتی ہے مرض بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اسے انصاف کے ساتھ ایک باعزت وجود دینا چاہیے تو اس کی بجائے نئی دنیا کے معیارِ زندگی کے حصول اور آسائشاتِ زندگی کے چکر میں اس کی زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے۔

ساحر لدھیانوی نے مردوں کے معاشرے کا عورتوں کے ساتھ عمومی رویہ ان دو مصرعوں میں بیان کیا ہے جو اردو قارئین میں بہت معروف ہیں اور کسی جغرافیائی قید و بند سے آزاد ہیں:

عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا، جب جی چاہا دھتکار دیا

رضیہ فصیح احمد نے اسی درد کو اپنے سلیقہ سے لکھا ہے:

جس کو تم کہتے ہو خوش بخت سدا ہے مظلوم
جینا ہر دور میں عورت کا خطا ہے لوگو

ان حقائق اور مبینہ ناکامیوں کے باوجود دنیا اسلام اور اس کے ماننے والوں پر جس رکیک انداز میں یکطرفہ حملے کرتی رہتی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر پلٹ کر سوال کر لیا جائے کہ کیا دیگر مذاہب اور ان کے پاسداروں میں عورت کو مکمل تحفظ اور حقوق حاصل ہیں؟ 'ہم بڑے ٹھہرے تو اچھا کون ہے؟' تو جواب میں جتنی رپورٹس اور تجزیے نیز حقائق دنیا کے تمام دفاتر میں بھرے پڑے ہیں وہ انہیں کا منہ چڑانے لگتے ہیں۔ ان کی زبان گنگ ہو جاتی ہے اور ''پھر بھی... پھر بھی...'' کی رٹ لگاتے ہوئے تاویلات کا پٹارا کھول دیتے ہیں۔ ان ہی کے درمیان سے ایسے لوگ بھی اٹھتے ہیں جو اسلام میں عورتوں کو دیے گئے صنفی یکسانیت کے حقوق اور انصاف سے متعلق انتہائی دیانتداری کے ساتھ شماریات پیش کرتے ہیں لیکن ان کی باتیں سننے اور پڑھنے والے کثیر تعداد میں نہیں ملتے۔ ان کی آواز نقارخانہ میں طوطی کی صدا بن جاتی ہے۔ مغرب میں تو سیاہ فام عورتوں کو رنگ و نسل کی بنیاد پر خود سفید فام عورتوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تیس سے زائد کتابوں کی سیاہ فام امریکی مصنفہ بیل ہکس (Bell Hooks) عورتوں کے ساتھ امتیازات سے متعلق ایک تحقیقی کتاب میں ایک جگہ لکھتی ہیں: ''اگر مرد حضرات خواتین سے ویسے ہی عائلی تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں جو صدیوں پہلے گھریلو زندگی کی پہچان تھے تو انہیں خواتین کے نازک جذبات سے آگاہ ہونا اور بے وفائی، تشدد اور بے جا حاکمیت کی روش سے باز آنا ہوگا کیونکہ یہی وہ امور تھے جنہوں نے صدیوں قبل حقوق نسواں کی تحریک کو ہوا دی تھی۔ نیز مردوں کو اپنی بیویوں کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی کی بنیاد پر زندگی گزارنے کی نیت کرنا ہوگی کیوں کہ صرف بچوں کی خاطر اکٹھے رہنا اچھی ازدواجی زندگی گزارنے کی علامت ہرگز نہیں۔'' مصنفہ نے ایک اہم حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ''کلیسا کی تاریخ میں مذہبی رسومات میں مردوں سے زیادہ خواتین کے حصہ لینے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مذہب اور عبادت کی صورت میں خواتین کو ایک ایسا گوشہ میسر آجاتا تھا کہ جس میں وہ مردوں کی مداخلت اور جبر سے محفوظ ہو کر خدا کی عبادت میں مشغول ہو جاتی تھیں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ دور جدید کی خواتین اس سوچ، فکر اور تجربہ سے محروم ہیں''۔ لہٰذا ہکس خواتین کو یہ پیغام دیتی ہیں کہ خاوندوں کے ساتھ گھریلو سکون کی تلاش کے ساتھ ساتھ یورپی خواتین کو مذہب کی جانب بھی رجوع کرنا چاہیے کیونکہ خدا کی عبادت وہ راستہ ہے، جہاں وہ اصل معنوں میں نسوانی روحانیت کا احساس محسوس کر سکتی ہیں۔ (ماخوذ، صالحہ فاطمہ)

صالحہ فاطمہ اپنے ایک مقالہ ''مغربی تحریکِ نسواں کا عصری بیانیہ: ایک تجزیاتی مطالعہ'' میں بحث کا خلاصہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''گذشتہ تین صدیوں کے دوران یورپ میں سر اٹھانے والی بیشتر فکری تحریکات مثلاً سیکولرازم، سوشل ازم، فاشزم اور پھر تحریکِ نسواں میں ایک قدر مشترک ہے کہ ان تحریکوں کی بنیاد نفرت کے جذبات پر رکھی گئی۔ مغربی خواتین میں مردوں کے خلاف نفرت کا اظہار ان کے تاریخی ظلم وستم کے خلاف شدید ردِعمل تھا جو بتدریج "Radical Feminists" کی صورت میں سامنے آیا جو خواتین کا ایسا گروہ تھا جو مردوں کی تحقیر کو اپنا ایمان سمجھتا تھا۔ پھر 1990 کے عشرے میں ان ہی خواتین کی جانب سے ایسا لٹریچر پیش کیا گیا کہ جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ اکیسویں صدی میں خواتین کو مردوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ انسانی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جو نظام یا ازم نفرت کی بنیاد پر جڑ پکڑتا ہے تو تعمیری اسلوب کی بجائے تخریب پسند ہو جاتا ہے، وہ کئی پہلوؤں سے حق پر ہوتے ہوئے بھی انتہا پسندی اور تشدد کے باعث ناحق اور ناجائز قرار پاتا ہے۔ یہی معاملہ تحریکِ نسواں کے ساتھ بھی نظر آتا ہے جب اس کی قائدین مردوں سے نفرت میں اتنی آگے نکل گئیں کہ قوانین فطرت سے بھی انکار کر دیا گیا تو وہی نتیجہ سامنے آیا جو متوقع تھا۔ چوں کہ مغرب کے پاس مذہب جیسا کوئی لائحہ عمل ہی نہ تھا کہ جس کی ہدایات پر چلتے ہوئے وہ مساوات کے ساتھ ساتھ فطری تقاضے بھی پورے کر پاتے۔ لہٰذا انہوں نے مساواتِ مرد وزن میں تمام حدود پار کر دیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عورت اور مرد انسانی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی اور آخرت میں اجر وسزا کے اعتبار سے برابر ہیں۔ اگر عورت جسمانی وذہنی اعتبار سے معاشی تمدن میں حصہ دار بننے کے اعتبار سے مرد سے کم ہے تو انسان سازی میں حصہ ڈالنے کے اعتبار سے

مرد سے بالاتر ہے۔ عورت کو کُلّی طور پر کم تر اور حقیر جگہ دینا کسی طور مناسب نہیں، نہ خواتین کو ایسا سوچنا چاہیے اور نہ مرد حضرات ہی کو۔ معاشرے میں عورتوں کو جائز مقام نہ دینے کے رویے نے عورت کے دل میں احساسِ کمتری کو اور مرد کے دل میں احساسِ برتری کو جگہ دی ہے ان منفی رویوں کا سدِّ باب اسلامی تعلیمات پر عمل درآمد کرنے سے ہی ممکن ہے۔'' (ششماہی 'رُشد'، جولائی 2015ء، لاہور)

اسلام میں عورتوں کے حقوق

اسلام کی آمد کے بعد انسان کو حیوانی سرِشت وطبع سے نجات ملی۔ خودشناسی کا شعور حاصل ہوا۔ باہم تکریم، وقار اور حقوق کے لین دین کا پیغام عام ہوا۔ اسلام سے قبل ہر معاشرے میں طاقت ور طبقہ کا بول بالا تھا۔ کمزور طبقہ طاقت ور کے زیرِ نگیں تھا۔ خواتین کی حالت اور پوزیشن سب سے زیادہ خراب تھی۔ حتیٰ کہ عورت اور عزت و تکریم دو الگ الگ چیزیں تھیں۔ کسی بھی دین و مذہب کے پیروکاروں میں عورت کو عزت کا مقام حاصل نہیں تھا۔ انھیں عجیب عجیب طعن و تشنیع اور لعنتی انداز سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ یہ تو گزرے زمانہ کی بات ہے۔ آج کے دور میں بھی عورتوں کے تئیں دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے رویہ میں کچھ خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ ہم اپنے آس پاس ہی دیکھ لیں کہ ہمارے گھروں میں جو بچی برسرِ روزگار نہیں ہوتی اس کی شادی تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔ جن لڑکیوں کی شادی نہیں ہو پاتی یا جو اوائل عمی میں ہی بیوہ ہو جاتی ہیں ان کے ساتھ بڑھتی ہوئی عمر میں جو کچھ پیش آتا ہے وہ عبرت انگیز داستانیں ہیں۔ غیر رشتہ دار عورتوں سے متعلق انتہائی پلید اور گرے ہوئے صنفی و جنسی خیالات موجود ہوتے ہیں۔ تازہ واقعات میں دیکھیے کہ کیرالہ کے زانی راہب کے خلاف ننوں نے صرف ایک احتجاجی ریلی میں حصہ لیا تو ایک نن کو چرچ ڈیوٹی کرنے سے روک دیا گیا۔ عورتوں کی پامالی تو جب ہوگی کہ انہیں وہ حقوق دیے گئے ہوں۔ یہاں تو ان کے حقوق سلب کرنے کی ایک مکمل تاریخ موجود ہے۔ حافظ محمد ادریس اپنے مضمون ''رسولِ رحمتؐ اور حقوقِ نسواں'' میں تحریر کرتے ہیں: ''مغربی معاشرے نے بے خدا تہذیب کے زیرِ اثر ترقی و روشن خیالی کے نام پر ایسے ایسے گھناؤنے جرائم کیے ہیں کہ انسانیت و شرافت سر پیٹ کے رہ جاتی ہے۔ عورت کو نام نہاد آزادی کے جھوٹے خواب دکھا کر اسے شمع محفل بنا دیا گیا۔ بے چاری سادہ لوح عورت سمجھی کہ اسے اعزاز بخشا جا رہا ہے، مگر ظالم شیطانی تہذیب نے اس سے اس کی حیا چھینی، اسے بازار کا بکاؤ مال بنایا، پھر اس سے مطالبہ کیا کہ وہ معاشی دوڑ میں بھی مرد کے ساتھ برابر کی شریک ہو۔ معاش کمانے کے لیے اس کے گلے میں بھی جوا ڈال کر اسے مرد کے ساتھ جوت دیا گیا۔ اسلام نے عورت کو وراثت میں حصہ دیا، مگر معاشی بوجھ سے اسے بری قرار دیا گیا۔ وہ اپنی دولت و ثروت میں سے حسبِ ظروف و ضرورت رضاکارانہ خرچ کر سکتی ہے، مگر بطور ماں، بیوی، بہن اور بیٹی اس کی معاشی کفالت بیٹے، خاوند، بھائی اور باپ کے ذمے ہے۔ آج بھی مغرب میں خواتین کے اسلام قبول کرنے کی شرح مردوں سے زیادہ ہے تو اس کا سب سے بڑا عامل اسلام میں خواتین کو دی گئی عزت اور تحفظ کی ضمانت ہی ہے۔ خواتین کے حقوق کے سب سے بڑے ضامن رسولِ رحمت ﷺ اور محفوظ ترین قلعہ دین اسلام ہی ہے۔'' مولانا تنویر خالد قاسمی نے اپنے ایک مقالہ میں عورتوں کی اسلام میں پوزیشن وحیثیت کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے: ''مشتے از خروارے'' کے طور پر اسلامی مساوات میں ہم ''حقوق نسواں'' پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جو عورت عالم گیتی پر جانوروں، بلکہ جانوروں سے بھی زیادہ بے وقعت و مظلوم تھی، کو اسلام نے ذلت و نکبت کے تحت الثریٰ سے اٹھا کر بلندی و عظمت کے بام ثریا پر رونق افروز کر دیا، اور اسے ایسے ایسے حقوق عطا کیے جس کا تصور بھی اسلام سے پہلے ناممکن اور معدوم تھا...، مگر آج جب کہ ہر طرف سے اسلام پر یورش ہو رہی ہے اور طرح طرح کی بے جا تنقیدوں اور لغو اتہامات کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور اسلامی اقدار و روایات کو ناقص بلکہ ظلم اور عدم مساوات سے عبارت گردانا جا رہا ہے اور زور و شور سے اس بات کا پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو اس ناجائز حقوق سے محروم رکھا ہے، اور اس کے ساتھ عدل و مساوات کا معاملہ نہیں کیا، حالانکہ اگر عقل و خرد کو تعصب سے پاک و صاف رکھا جائے اور دل و دماغ سے منصفانہ جائز لیا جائے تو یہ بات آفتابِ نیم روز کی طرح عیاں ہو جائے گی، کہ عورت چونکہ تمدن انسانی کا محور و مرکز ہے، گلشن ارضی کی زینت ہے، اس لیے اسلام نے باوقار طریقے سے اسے تمام معاشرتی حقوق سے نوازا جن کی وہ مستحق تھی، چنانچہ اسلام نے عورت کو گھر کی ملکہ قرار دیا، دیگر اقوام کے برعکس اسے ذاتی جائداد و مال رکھنے کا حق عطا کیا، شوہر سے ناچاقی کی صورت میں خلع کی صورت دکھلائی، وراثت میں اس کا حصہ مقرر کرایا، اسے معاشرہ کی قابل احترام ہستی قرار دیا اور اس کے تمام جائز قانونی حقوق کی نشان دہی کی، حاصل یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جس قدر حقوق دیے ہیں، خواہ اس کا تعلق ذاتی جائداد و وراثت سے ہو یا شادی یا طلاق کا مسئلہ ہو، کوئی دوسرا مذہب اس کا عشر عشیر بھی پیش کرنے سے عاجز و قاصر ہے۔ دوسری طرف اگر آج ہم افترا پردازوں کے نعرے اور ان کے نتائج پر غور کریں تو اس پر فریب نعرہ نے اس بے چاری کو اس کے سوا کچھ نہیں دیا کہ وہ دفتروں میں کلرکی کرے، اجنبی مردوں کی پرائیویٹ سکریٹری بنے، تجارت چمکانے کے لیے سیلز گرل بنے اور اپنے ایک ایک عضو کو سر بازار رسوا

کر کے گاہکوں کو دعوت نظارہ دے...ان سب کا نتیجہ کیا نکلا؟ طلاق کی شرح میں زبردست اضافہ، ناجائز بچوں کی بہتات، ایڈز کا شیوع، غرض یہ کہ تمام معاشرتی واخلاقی خرابیاں اسی نام نہاد ''آزادی نسواں'' کا ثمرہ تلخ ہے۔'' عموماً عورتوں کو زندگی میں تین اہم مراحل سے گذرنا پڑتا ہے: (1) پیدائش سے شادی تک (2) ازدواجی زندگی (3) شوہر کے بعد کی زندگی۔ پیدا ہونے سے لے کر شادی یعنی بلوغت کی عمر تک ایک بچی کی جان کی بقا، اس کے ساتھ حسنِ سلوک اور حسنِ تربیت کا معاملہ بھی اسلام نے جنت کے 'لازمی حصول' سے مربوط کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں رسولِ کریم ﷺ نے باقاعدہ ضمانت دی ہے۔ قرآن نے دختر کشی کی عادت و روایت کو ترک کروادیا۔ ازدواجی زندگی میں بیوی کے لیے ''انصاف واحترام'' کو لازم کیا۔ اگر تعددِ ازدواج کو بھی محدود کر دیا گیا ہے تاکہ لامحدود گناہوں سے بچا جاسکے۔ دوسرے مذہب کے پیروکاروں میں یہ عادتیں لامحدود ہیں۔ کہیں کوئی 'گرل فرینڈز' اور 'وِزٹ ایسکورٹس' پالتا ہے تو کہیں کوئی 'لیو اِن ریلیشن' کے ساتھ رہتا ہے۔ ''عورت کے لیے یہ کہیں زیادہ بہتر، کہیں زیادہ مسرت انگیز اور کہیں زیادہ عزت بخش ہے کہ وہ (اسلامی) تعدادِ ازدواج کے سسٹم کے تحت زندگی گزارے، وہ ایک مرد سے متعلق ہو، حلال بچہ اس کی آغوش میں ہو اور وہ عزت کے ساتھ جی رہی ہو، اس کے مقابلے میں (یورپین تعدد ازدواج) کہ اس کی عصمت دری کی جائے، وہ سڑکوں پر نکال باہر کر دی جائے، بسا اوقات ایک حرامی بچہ کے ساتھ جو غیر قانونی ہو، اس کی کوئی جائے پناہ نہ ہو، کوئی اس کی فکر کرنے والا نہ ہو، اس کی راتوں پر راتیں اس طرح گزاریں کہ وہ کسی بھی راہ گیر کا صید زبوں بننے کو تیار ہو، مادریت کے شرف سے محروم سب کی دھتکاری ہوئی ہو۔'' (Marriage commission report بحوالہ تعدادِ ازدواج: سید حامد علی)

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ملک ہندوستان اور پڑوسی ممالک میں بھی عورتوں کو ابھی اعلیٰ تعلیم تو چھوڑیے بیشتر مقامات پر اسکولی تعلیم بھی ملنے کا امکان ہنوز بہت کم ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ تہذیب وتمدن سے یکسر عاری ہوتی ہیں اور اپنے گھر کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی انہیں تربیت نہیں ملی ہوتی۔ یہ عورتیں صرف یہی نہیں کہ گھریلو ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی ادا کرتی ہیں بلکہ اپنے نونہالوں کو بھی اپنے گھر اور خاندان کی روایتوں اور قدروں سے آشنا کر کے مہذب بنانے کی پوری کوشش کرتی ہیں۔ شادی کے بعد اگر عورت جلد یا بہ دیر بیوہ ہو جائے تو دیگر مذاہب میں اسے شوہر کی جائداد میں کبھی کوئی حصہ نہیں ملتا تھا اور اب بھی یہی دستور موجود ہے۔ اسی سبب بیشتر اور خصوصاً ہندوؤں میں عورتوں کو شادی پر جہیز دینے اور لینے کا رواج موجود ہے۔ کیوں کہ شادی کے بعد اس عورت کا باپ

کی جائداد میں بھی کوئی حصہ نہیں رہ جاتا۔ یہ سراسر ناانصافی اور صنفی امتیاز اور حق تلفی کی ایک اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اسی لیے لاکھوں تحریکات چلائی جائیں تب بھی جہیز کی رسم کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ دہلی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر راجندر صاحب نے ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''تاریخی طور پر اسلام عورتوں کو جائداد کے حقوق دینے میں بہت زیادہ فراخ دل اور ترقی پسند رہا ہے، یہ حقیقت ہے کہ 1956 میں ہندو کوڈ بل سے قبل ہندو عورتوں کا جائداد میں کوئی حصہ نہیں تھا، حالانکہ اسلام مسلم عورتوں کو یہ حق 14 سو سال پہلے دے چکا تھا۔'' (The Statement Delhi)

آج کل تحریکات کے علاوہ باہمی بحث وتمحیث کا بھی دور دورہ ہے۔ جب بھی گفتگو ہوتی ہے تو عنوانات عورتوں کو یکساں شہری وانسانی حقوق، ان پر جبر وتشدد کا سدِ باب، خودمختاری، آزادی جیسے دلفریب عنوانات پر ہوتی ہے۔ طول طویل گفتگو اور مضامین وشماریات کے ابواب کھل جاتے ہیں۔ اگر نہیں ہوتی تفصیلی یا منطقی بات؛ تو ان کے ساتھ ''انصاف اور ظلم سے نجات'' کی نہیں ہوتی۔ یہاں پوری دنیا کا وہ مفاد چوٹ کھاتا ہے جو دنیا کسی بھی صورت میں قربان کرنے پر آمادہ نہیں ہے اور نہ اس پر کوئی گفتگو پسند ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا اور سمجھا جاسکتا ہے کہ پوری دنیا کو چھوڑیے لیکن آخر مسلمانوں میں احکام وتشریحات موجود ہونے کے بعد بھی اس پر عمل کیوں نظر نہیں آتے؟ کیوں نہیں لڑکیوں اور عورتوں کو ان کے حقوق پورے پورے انصاف کے ساتھ دے دیے جاتے؟ کہیں دیکھیے تو برادرانِ وطن کی مانند کہہ دیا جاتا ہے کہ شادی کے وقت انھیں سب کچھ دے دیا گیا تھا! ہمارے مشاہدہ میں یہ بات بھی ہے ثانوی تعلیم تک تو کسی صورت بچیوں کو

پڑھایا جاتا ہے لیکن اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لڑکوں کے مقابلہ میں ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ ثانوی تعلیم میں بھی ہمارے معاشرہ میں بیٹیوں کو اردو یا دیگر ورنا کولر میڈیم میں داخل کرواتے ہیں یعنی کم خرچ کرنا مقصد ہوتا ہے جب کہ بیٹیوں کے لیے مہنگے سے مہنگے اور معیاری نظر آنے والے انگریزی میڈیم کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔ توجیہ صاف بیان بھی کرجاتے ہیں کہ لڑکی تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ گویا 'انویسٹ منٹ' میں نقصان کا سودا کیوں کریں؟ باپ کے انتقال کے بعد عموماً گھر کا بڑا بیٹا باپ کی جائداد اور دیگر اثاثوں پر قابض ہوجاتا ہے۔ حیلوں اور بہانوں کے ساتھ بیوہ ماں (حصوصاً سوتیلی) اور بہنوں کے حقوق کو ایک طویل عرصہ تک ادا نہیں کیا جاتا یا بسا اوقات (شمالی ہند میں بہت عام ہے) کہ غیر منقولہ جائداد کو غصب کرلیا جاتا ہے۔ ایسا اس لیے بھی ہوتا ہے کہ وہ اس حق سلبی یا عدم ادائیگی کے انجام سے واقف نہیں ہیں یا اس بارے میں معلومات بھی حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ عورتوں کی عمر بھی زیادہ ہوجائے تو ان کی شادی نیز مطلقہ یا کسی اور صورت میں اپنے شوہر سے علیٰحدہ ہوجانے والی عورتوں کی دوسری شادی کا مسئلہ بھی ہمارے معاشرہ میں قابل قبول حل کو اب تک نہیں پہنچا ہے۔ ہمارا معاشرہ اس بارے میں اسلامی احکام سے صرفِ نظر کرتے ہوئے بہت ساری مشرقی عادات کا شکار ہے۔ جب کہ دوسری یا تیسری شادی کرنے والا مرد نئی دلہن بھی باکرہ تلاش کرنے کے موڈ میں رہتا ہے۔ یہ بھی تو عورتوں کا حق مارنا ہی ہوا۔ عورتیں تہی دست ہونے اور مکمل طور پر دست نگر رہنے کی وجہ سے خود کو بااختیار و طاقت ور نہیں سمجھ پاتیں اور خود سے کوئی فیصلہ کرنے میں بھی بہت جھجکتی ہیں۔ بہت سے موقعوں پر صحیح فیصلہ کرلیں تو بھی انتہائی سراسیمہ ہوتی ہیں کہ خدانخواستہ بمع شوہر گھر کے دیگر افراد کی طبیعت کو ناپسند ہوا تو بڑی مشکل ہوجائے گی۔

بہر کیف عورتوں کے ساتھ کی جانے والی ناانصافی اور ظلم کو دور کیے بغیر ان کے حقوق پر باتیں کرنا کوئی زیبا باتیں نہیں ہیں۔ حقوق دینا یا لینا تو انصاف کی منزل کے بعد کی چیزیں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ دنیا ان سیدھی سچی اسلامی باتوں کو آسانی کے ساتھ قبول نہیں کرنے والی ہے؛ لیکن کم سے کم مسلمانوں کو تو اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ وہ اسلام کے احکام اور ان کے نفاذ کو اپنے معاشرہ کے لیے لازم سمجھتے ہیں اور اس فیصلے میں ثالث کوئی نہیں ہے سوائے اللہ کے حکم اور رسولِ اکرم ﷺ کی اطاعت کے۔ یہ نصوص گزشتہ ساڑھے چودہ صدیوں سے موجود ہیں۔

"

دنیا کے جن ملکوں میں خواتین سماجی اعتبار سے بہت پچھڑی ہوئی ہیں ، اور ظلم و استحصال کا شکار ہیں ان میں ایک نمایاں ملک ہمارا وطن ہندوستان ہے۔ ہندوستان میں خواتین کی صورت حال پر بہت سی رپورٹیں آئی ہیں اور دنیا بھر میں اس پر تشویش کا اظہار ہوتا رہا ہے۔

ہندوستان میں خواتین پر ظلم دوطرفہ ہے۔ ایک طرف ظلم کی روایتی شکلیں ہیں اور عام طور پر اس کی شکار کم تعلیم یافتہ، دیہی اور پسماندہ خواتین سمجھی جاتی ہیں، اور دوسری طرف ظلم کی جدید اور ترقی یافتہ شکلیں ہیں جن کی شکار زیادہ تر تعلیم یافتہ شہری خواتین ہیں۔

یہ صورت حال خواتین کی اسلامی تحریک کے لیے بیک وقت ایک چیلنج بھی ہے اور ایک موقع بھی۔ چیلنج اس لیے کہ اسلام کی علم بردار خواتین، اللہ کی بندیوں کو اس مظلومیت کی حالت میں نہیں دیکھ سکتیں اور موقع اس لیے کہ یہ صورت حال اسلام کی دعوت اور نصف انسانیت کو مؤثر قیادت و رہنمائی فراہم کرنے کا پلیٹ فارم مہیا کرتی ہے۔

سید سعادت اللہ حسینی
(خواتین میں اسلامی تحریک، ص58)

"

اڈوانی کی تلخی اور راہل کی شیرینی

ڈاکٹر سلیم خان

راہل گاندھی کے استعفیٰ پر تنقید کرنے والوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تین مرتبہ بی جے پی کے صدر رہے لال کرشن اڈوانی بھی دومرتبہ استعفیٰ دے چکے ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ جو تلخی، ناراضگی اور مایوسی اڈوانی جی کے یہاں پائی جاتی تھی اس کا شائبہ تک راہل کے استعفیٰ میں موجود نہیں ہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب سونیا گاندھی اپنی پارٹی کو کامیابی دلانے کے باوجود وزیراعظم نہیں بن سکی تھیں۔ لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ راہل گاندھی کو پتہ ہے کہ اگر مستقبل میں کانگریس کو اکثریت مل جائے تو بالا اتفاق وزیراعظم وہی بنیں گے کانگریس کا صدر چاہے جو بھی ہو۔ وزیراعظم نریندر مودی میں اس طرح کی خود اعتمادی کا فقدان پایا جاتا ہے۔ اسی لیے 2014 کے بعد لال کرشن اڈوانی کو مارگ درشک منڈل کا راستہ دکھایا گیا اور 2019 کے بعد راجناتھ سنگھ کو ان کا درجہ گھٹانے کے لیے وزارت داخلہ سے محروم کر کے وزیر دفاع بنایا گیا۔ راہل گاندھی کے ساتھ جس عقیدت اور یکجہتی کا اظہار کانگریس پارٹی نے کیا ہے اس پر بھی بی جے پی کے رہنماؤں کو رشک آرہا ہوگا۔ زعفرانی جماعت کے اندر ایسا نہیں ہوتا۔ بی جے پی کے قیام کے وقت اٹل بہاری واجپائی کو پارٹی کا صدر بنایا گیا تھا اور وہ گاندھیائی سوشلزم کی بنیاد پر پارٹی کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اندرا گاندھی کی موت کے بعد جب بی جے پی دونشستوں پر سمٹ گئی اور اٹل و اڈوانی دونوں ہار گئے تو اس صورتحال کا بھرپور فائدہ اٹھا کر اٹل بہاری واجپائی کو پارٹی کے اندر حاشیے پر لگا دیا گیا۔

اس وقت کے نریندر مودی یعنی لال کرشن اڈوانی نے اپنے یار کو پارٹی میں بے وقعت تو کر دیا لیکن قدرت کا کرنا یہ ہوا کہ 1996 میں بی جے پی کو واضح اکثریت نہیں مل سکی اور بابری مسجد کے خلاف اڈوانی کی شدت پسندی نے انہیں دیگر حامی جماعتوں کے ناقابلِ قبول بنا دیا ورنہ اٹل جی کو بھی مارگ درشک منڈل کا راستہ دکھانے کام اڈوانی جی کے ذریعہ کیا جاتا اور بعید نہیں کہ حسبِ روایت امیت شاہ بھی مودی جی کے ساتھ یہی معاملہ فرمائیں۔ اٹل جی کو وزیراعظم بننے سے روکنے میں ناکامی کے بعد اڈوانی جی چین سے نہیں بیٹھے بلکہ پارٹی کے اندر واجپائی کے اثر رسوخ کو ختم کرنے کی جدوجہد میں لگے رہے۔ اٹل جی کے منظورِ نظر صدر نشین بنگارو لکشمن کو تہلکہ کے ذریعہ پھنسانے کی سازش میں شک کی سوئی اڈوانی کی جانب گھومتی ہے۔ ویسے اگر یہ الزام درست نہ ہو تب بھی انہوں اس کا بھرپور فائدہ تو اٹھا ہی لیا۔

لال کرشن اڈوانی کے چکرویوہ سے اُس وقت کے وزیر دفاع جارج فرنانڈیس بھی نہیں بچ پائے۔ جارج کی رسوائی کے لیے اڈوانی کو ذمہ دار سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کا براہِ راست فائدہ انہیں ملا اور وہ نائب وزیراعظم بن گئے۔ جارج کا کانٹا نکلنے کے بعد بھی انہیں حلف لینے کے لیے ایک سال سے زیادہ جدوجہد کرنی پڑی لیکن بالآخر کامیاب ہو گئے۔ وہ ایسا زمانہ تھا کہ مودی کی مانند ان کا ہر داؤ چل جاتا تھا۔ اب ایسا وقت آگیا ہے کہ راہل کی طرح ہر وار خالی جاتا ہے۔ اس زمانے میں سنگھ سے درآمد شدہ پارٹی کے طاقتور جنرل سکریٹری گووندا چاریہ نے اڈوانی جی کے آشیرواد سے اپنے وقت کے وزیراعظم کو مکھوٹا کہنے کی جرات کر ڈالی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی بہت قیمت گووندا چاریہ کو چکانی پڑی اور ان کا سورج ایسا ڈوبا کہ پھر ابھر نہ سکا۔

اٹل اور اڈوانی کی باہمی چپقلش کا سب سے بڑا فائدہ اس وقت گجرات کے وزیراعلیٰ نریندر مودی کو ملا۔ ایل کے اڈوانی نے خود اپنی تحریر میں اس کا اعتراف اس طرح کیا ہے کہ ”فروری 2002 میں جب گجرات فرقہ وارانہ فساد کی آگ میں جل رہا تھا تب مخالف پارٹیوں کے ساتھ ساتھ بی جے پی کی معاون جماعتیں بھی اس وقت کے وزیراعلیٰ نریندر مودی کا استعفیٰ نامہ

طلب کر رہی تھیں۔ اس دباؤ کی وجہ سے بی جے پی اور برسر اقتدار این ڈی اے کے کئی رہنماؤں کا خیال تھا کہ مودی کو عہدہ چھوڑ دینا چاہیے۔ گجرات میں جاری فسادات کے متعلق اٹل جی کے ذہن پر بھی کافی بوجھ تھا اور مودی کے استعفیٰ کے لیے ان پر لگاتار دباؤ ڈالا جانے لگا تھا مگر اس معاملے پر میرا نظریہ بالکل الگ تھا۔ میری رائے میں مودی مجرم نہیں تھے۔ ایک سال سے بھی کم وقت پہلے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالنے والے نریندر مودی کو ریاست میں پیدا ہونے والے مشکل فرقہ وارانہ ماحول کا شکار بنانا ناانصافی تھی۔''

اپنے مضمون میں اڈوانی نے آگے لکھا کہ اسی دوران گوا میں بی جے پی کی قومی مجلس عاملہ کی نشست میں جسونت سنگھ کے پوچھنے پر اٹل جی نے کہا کہ مودی کو کم از کم استعفیٰ کی تجویز تو دینی ہی چاہیے۔ اس پر اڈوانی نے کہا کہ اگر مودی کے عہدہ چھوڑنے سے حالات میں بہتری ہوتی ہو تو میں چاہوں گا کہ انہیں استعفیٰ دینے کو کہا جائے لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اس سے کوئی فائدہ ہوگا۔ اس بابت انہوں نے مودی سے بات کر کے کہا کہ وہ استعفیٰ کی تجویز رکھیں گے اور وہ مان گئے۔ لیکن جب مودی نے استعفیٰ کی بات کہی تب اس کی مخالفت کی گئی اور اس طرح اس مسئلہ پر پارٹی کے اندر بحث کا خاتمہ ہو گیا۔ وقت کا پہیہ گھومتے گھومتے 11 سال بعد پھر سے گوا میں پہنچ گیا۔ جہاں نریندر مودی کو تشہیری کمیٹی کا سربراہ بنا کر بلا واسطہ اگلا وزیر اعظم کا امیدوار نامزد کر دیا گیا۔ لال کرشن اڈوانی کی شاگردہ سشما سوراج نے (جنہیں وہ پارٹی صدر بنانا چاہتے تھے) اس کی سخت مخالفت کی لیکن ان کی ایک نہ چلی اس لیے کہ پارٹی کے صدر راجناتھ سنگھ نے مودی کی حمایت کر دی تھی۔

اڈوانی جی نے اس فیصلے سے بددل ہو کر جون 2013 میں پارٹی کے سارے عہدوں سے استعفیٰ دے دیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے استعفی نامہ پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اپنی پارٹی کے صدر کو مخاطب کر کے اڈوانی نے لکھا ''ڈیئر شری راجناتھ سنگھ جی، میں نے اپنی تمام زندگی جن سنگھ اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیے کام کرتے ہوئے نہایت فخر اور بے شمار سکون حاصل کیا ہے۔ کچھ عرصے سے پارٹی کے موجودہ طریقہ کار یا اس کے غالب رجحان سے مصالحت کرنا میرے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ اب یہ وہ مثالی جماعت نہیں رہی جس کے قیام میں ڈاکٹر مکر جی، دین دیال پادھیائے، نانا جی اور واجپائی جی کا ہاتھ رہا ہے اور جن کے پیش نظر صرف ملک اور باشندگان وطن (کی خدمت) کا لازوال جذبہ تھا۔ ہمارے بیشتر موجودہ قائدین کے نزدیک اپنے ذاتی مفادات کی تکمیل ہی واحد مقصد ہو گیا ہے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ پارٹی کے تین اہم عہدوں بنام قومی مجلس عاملہ، پارلیمانی بورڈ اور الیکشن کمیٹی سے مستعفی ہو جاؤں۔ اس خط کو میرا استعفیٰ نامہ تصور کیا جائے۔ آپ کا مخلص ایل کے اڈوانی۔''

پارٹی کے صدر راجناتھ سنگھ نے استعفیٰ تو مسترد کر دیا لیکن اس کے ذرائع ابلاغ میں آنے سے جو نقصان ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اس خط کی روح یہ اعتراف ہے کہ اب بی جے پی اپنے مقصد و نصب العین سے منحرف ہو چکی ہے۔ ذاتی مفاد نے قومی خدمت کی جگہ لے لی ہے یعنی بہ الفاظ دیگر بی جے پی اب موجی پی بن چکی ہے۔ وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ اڈوانی جی کے اندیشے صد فیصد درست تھے۔ بی جے پی کے اس نئے اوتار میں مودی کی حیثیت رہنما کی نہیں بلکہ دیوتا کی ہو گئی۔ مودی کے فائدے نے قومی مفاد پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ اس فیصلے کے دو بڑے مخالف سشما سوراج اور اڈوانی تھے جبکہ اہم ترین حامیوں میں راجناتھ سنگھ اور ارون جیٹلی شامل تھے۔ 2014 میں بی جے پی انتخاب جیت گئی۔ راجناتھ کو وزیر داخلہ، ارون جیٹلی کو وزیر خزانہ اور سشما سوراج کو وزیر خارجہ بنایا گیا مگر اڈوانی جی کو دودھ سے مکھی کی مانند نکال کر مارگ درشک منڈل میں روانہ کر دیا گیا۔ اڈوانی جی کو توقع تھی کہ پرلوک سدھارنے سے قبل کچھ نہیں تو صدر مملکت ہی بنا دیا جائے گا لیکن مودی جی نے اس خواب کو بھی چکنا چور کر دیا۔

2019 کے انتخاب آتے آتے پارٹی پر مودی جی نے اپنی پکڑ اتنی مضبوط کر لی کہ سشما انتخاب کے میدان سے بھاگ کھڑی ہوئیں۔ ارون جیٹلی صحت کا بہانہ بنا کر کنارے ہو گئے۔ گاندھی نگر سے اڈوانی کا ٹکٹ کاٹ کر امیت شاہ کو تھما دیا گیا لیکن ابھی ترُپ کی چال پوشیدہ تھی۔ نتائج کے بعد مودی جی نے اپنے محسنِ اعظم راجناتھ سنگھ کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر وزیر داخلہ کا قلمدان اپنے دست راست امیت شاہ کے حوالے کر دیا اور راجناتھ کو وزیر دفاع بنا دیا گیا۔ ان کے پَر کترنے کے لیے دو کابینائی کمیٹیوں کے علاوہ باقی تمام سے ان کا پتہ کاٹ دیا گیا۔ مودی جی فی الحال اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ راجناتھ سنگھ نے پارٹی کے اندر گہار لگا کر اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا نیز سنا ہے استعفیٰ کی دھمکی بھی دے دی۔ اس کے بعد انہیں مزید چار کمیٹیوں میں شامل کیا گیا مگر وہ امیت شاہ کی طرح تمام 08 کمیٹیوں کا حصہ نہیں بن سکے۔ بدقسمتی سے ذرائع ابلاغ کو کمل کے داغ دکھائی ہی نہیں دیتے اس لیے وہ پنجہ جھاڑ کر پنجے کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ پارٹی کی خدمت میں عمر عزیز کھپا دینے والے ایل کے اڈوانی کے مایوس کن خط کا موازنہ اگر راہل گاندھی کے استعفیٰ سے کیا جائے تو دونوں جماعتوں کے ظرف کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

DR SALEEM KHAN
Vice President
Idara-e-Adab-e-Islami Hind,
Author & Political Analyst, Mumbai
Email: drsalimkhan@gmail.com

امریکہ-ایران سرد جنگ

ٹرمپ کی حکمت عملی ناکام ہوسکتی ہے

حسان احمدین

1941 میں دوسری عالمی جنگ کے دوران دو استعماری طاقتوں برطانیہ اور سویت یونین روس نے ایران کو ایران پر فوج کشی کرنے کی دھمکی دی۔ باوجود اس کے کہ ایران نے جنگ میں غیر جانبداری کا رسمی طور پر اعلان کر دیا تھا۔ جب ایرانی قیادت نے حالات کی سنگینی کو محسوس کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ برطانیہ اور روس میں سے کسی کا بھی ساتھ نہیں دیں گے۔ اس قیادت کے لیے ملک کی بدخواہی اور سپر پاورس کی اطاعت سے زیادہ مزاحمت اور فوجی شکست قابل قبول تھی۔

ایرانی فوج کو جو کہ تعداد اور اسلحہ میں کم تھی، برطانوی اور سویت یونین کی فوجوں سے شکست ملی اور ان سامراجی ممالک نے کئی سال تک ایران پر اپنا قبضہ جمائے رکھا۔ انتہائی کمزور ہوجانے کے باوجود تہران نے اپنی خود مختاری اور آزادی کی جدوجہد جاری رکھی اور عالمی جنگ کے خاتمہ کے ایک سال بعد قابض طاقتوں کو انخلاء پر مجبور کر کے اسے حاصل بھی کر لیا۔

یہ اور ایران کی جدید تاریخ کے متعدد ابواب اس بات کے غماز ہیں کہ مزاحمت ایرانی سیاسی مزاج کا بنیادی خاصہ ہے اور یہی خاصہ ایران کی خارجہ پالیسی کی تشکیل کا بنیادی محرک ہے۔ آج جب کہ ایران کی خود مختاری کو ایک اور خطرہ درپیش ہے، ایران بعینہ اسی اصول (اصول مزاحمت) پر کاربند رہے گا۔ درحقیقت، موجودہ اسلامی جمہوریہ کے سیاسی کردار میں سابقہ حکومتوں سے زیادہ 'مزاحمت' کا مادہ موجود ہے۔ دیگر متعدد عوامل کے ساتھ ساتھ مزاحمت کا یہ اصول بھی ایرانیوں کو سرنگوں کرنے کے امریکی خواب کی ناکامی کی ضمانت ہے۔

کیوں ”زیادہ سے زیادہ دباؤ“ کی پالیسی کام نہیں کرے گی

اپریل میں ٹرمپ انتظامیہ نے اعلان کیا کہ ایران سے تیل درآمد کرنے والے ممالک پر عائد کی گئی پابندیاں ختم نہیں کی جائیں گی اور دھمکی دی کہ اس کے ذریعہ عائد کی گئی پابندیوں کی خلاف ورزی کرنے والے ممالک پر سخت کاروائی کی جائے گی۔ اس اعلان کے بعد ہی سے امریکہ نے اپنی ''زیادہ سے زیادہ دباؤ'' کی مہم کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی دھمکیوں اور معاندانہ بیانوں میں اضافہ کر دیا۔

اس حکمت عملی کا مقدمہ اسلامی جمہوریہ ایران کے لیے اس کے اپنے وجود اور بقاء کو خطرہ کی شکل میں سامنے آیا۔ امریکی بیانیہ یہ ہے کہ ایرانی معیشت کو بدترین صورت حال سے دوچار کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایرانی عوام اپنی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور ایرانی حکومت کو 'حقیقی صورت حال کے مطابق' اقدامات کرنے پر مجبور کریں گے۔ واشنگٹن یہ امید کر رہا ہے کہ امریکہ کی یہ حکمت عملی تہران کو دیوالیہ کر دے گی اور اسے امریکہ کی طے کردہ نئی شرائط کو تسلیم کرتے ہوئے مذاکرات کی میز پر آنے پر مجبور کرے گی۔ مگر واشنگٹن کو بڑی مایوسی ہاتھ آسکتی ہے۔ ٹرمپ انتظامیہ کی توقع یہ ہے کہ ''زیادہ سے زیادہ دباؤ'' کے بعد ایران کے پاس سر اطاعت خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ بچے گا، درآں حالیکہ ایران میں اس بات پر تقریباً صد فیصد اتفاق ہے کہ چاہے جو ہو، ایرانی مزاحمت ہی کریں گے۔

اسلامی جمہوریہ ایران کی قیادت نے عوام کو اس بات کا قائل کر لیا ہے کہ کسی بھی قسم کی امریکہ نوازی کی قیمت امریکہ کے سامنے سپر ڈال کر چکانی پڑے گی۔ ایرانی قیادت نے ٹرمپ انتظامیہ کی دھمکیوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیا ہے اور اب تک عوام کی ذہن سازی میں کامیاب رہی ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ ایرانی عوام پہلے ہی معاشی بحران میں مبتلا ہیں، امریکہ کی ''زیادہ سے زیادہ دباؤ'' ڈالنے کی پالیسی بجائے اس کے کہ عوام کو اپنی حکومت کا تختہ پلٹنے کی کوشش پر اکسائے، وہ عوام کو ایک پرچم تلے متحد کر رہی ہے۔ ایسا صرف اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس وقت حکومتی مزاحمت نسبتاً زیادہ ہے بلکہ یہ اس وجہ سے بھی ہے کہ جتنا زیادہ ایرانی حکومت مزاحمت کرتی ہے اتنا زیادہ وہ اپنی لیاقت و قابلیت کو ثابت کرتی ہے۔ گزشتہ چار دہائیوں میں اگر کچھ ہوا ہے تو وہ یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران مزاحمت کی بناء پر حاصل شدہ عوامی قبولیت کو غاصب قوتوں سے مذاکرات کے عوض فروخت نہیں کرے گا۔ اس وجہ سے ''زیادہ سے زیادہ دباؤ'' کی پالیسی کا زیادہ سے زیادہ نتیجہ یہ سامنے آئے گا کہ ایران امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ کے ساتھ مذاکرات کی ٹیبل پر تو آجائے گا مگر یکطرفہ شرائط کے بغیر! اس کے ساتھ ہی امریکی دباؤ کا سامنا کرتے ہوئے ایران ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہے گا۔ ایران کے پاس واشنگٹن کی اصل علاقائی ترجیح - تیل کی قیمتوں - کو کسی بھاری قیمت اور مشقت کے بغیر متاثر کرنے کی صلاحیت ہے، اور ایران کسی فوجی تصادم کے بغیر یہ کام کرنے پر قادر ہے۔ ایران خطہ اور ماورائے خطہ کے دوست اور حلیف ممالک کے جال کو استعمال کرتے ہوئے تیل کی پیداوار اور عالمی تجارت میں خلل ڈال سکتا ہے۔

مزید یہ کہ ایران کا یورپین یونین کے ساتھ ٹریفکنگ مخالف آپریشن بھی متاثر ہوسکتا ہے۔ ایرانی حکام کاغذ پر تو یورپین یونین کے ان معاہدوں پر کاربند ہوں گے لیکن عملاً کچھ نہیں کریں گے۔ یہ طرز عمل یورپین ممالک کی سرحدوں کی جانب ہجرتوں کی یا نشہ آور اشیاء کی اسمگلنگ کی ایک اورلہر کی راہ ہموار کرسکتا ہے۔

ایک ایسی جنگ جسے امریکہ ختم نہیں کرسکے گا!

اگر واشنگٹن ایران کے خلاف جنگ کا آغاز بھی کردے تو یہ تصور کرنا محال ہے کہ ایران گھٹنے ٹیک دے گا۔ اگر جنگ شروع ہوتی ہے تو کم از کم تین تحدیات (Challenges) ایسے ہیں جن کا سامنا امریکہ کا لامحالہ کرنا ہی ہوگا:

اول، امریکہ کے عالمی دشمن روس اور چین غیر رسمی طور پر ہی سہی لیکن ایرانی مزاہمت کی حمایت کریں گے۔ ایشیا میں امریکہ کی دخل اندازیوں اور ٹرمپ کی چھیڑی ہوئی تجارتی جنگ سے دونوں ممالک پہلے ہی چڑھے ہوئے ہیں۔ ایران سے امریکہ کا تصادم ان عالمی طاقتوں کے لیے امریکہ سے بدلہ لینے کا ایک موقع ہوگا۔ ظاہر ہے ایران کے لیے نہ چائنا جنگ میں حصہ لے گا اور نہ روس، لیکن اپنے حلیف کو سرمایہ فراہم کرنا اسٹریٹجک اہمیت کا حامل ہوگا۔ ٹرمپ کے روکنے اور تہران سے تصادم کے ذریعہ ٹرمپ کو دیوالیہ کرنے میں، تاکہ وہ ان کی سرحدوں کے آس پاس کوئی تباہی نہ مچا سکے، دونوں کی دلچسپی ہے۔ فوجی اور مالی امداد کے ساتھ ساتھ یہ دونوں ممالک اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ایران کی حمایت بھی کرسکتے ہیں۔

دوم، اگر ٹرمپ ایران کے خلاف کوئی جنگ چھیڑتے ہیں تو انہیں عالمی سطح پر اس سے بھی زیادہ وسیع تر علاحدگی (Isolation) کا سامنا کرنا پڑے گا جتنا انہیں اپنی خودغرضانہ پالیسیوں کی وجہ سے کرنا پڑ رہا ہے۔ آج ایران اپنے اسٹریٹجک صبر اور نیوکلیر ڈیل کی پاسداری کی وجہ سے ایک اخلاقی برتری رکھتا ہے، جب کہ دوسری طرف ٹرمپ کے جارحیت پسندانہ طرز عمل کو عالمی برادری مسترد کرتی رہی ہے۔ امریکہ کے سکریٹری برائے اسٹیٹ مائک پومپیو کو امریکہ کی سافٹ پاور کے حدود سے آگاہ کیا گیا، خاص طور سے ان کے یورپ کے حالیہ دوروں کے بعد کہ جہاں ان کا سرد استقبال کیا گیا اور ایران کے سلسلے امریکی پالیسی پر سرزنش کی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹرمپ دنیا کو امریکہ پر قیاس کررہے ہیں کہ جب امریکہ کچھ کرے گا تو دنیا اس کی پیروی کرے گی۔ لیکن عالمی معاہدوں اور قراردوں کی خلاف ورزی ایک چیز ہے اور جنگ چھیڑنا ایک بالکل دوسری چیز۔ بگمان غالب، اگر امریکہ جنگ کا راستہ اختیار کرتا ہے، تو اس میں اسے اپنے روایتی حلیفوں کے بغیر ہی کودنا ہوگا۔ اس کے علاقائی شریک کار ممالک سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور اسرائیل بھی ممکن ہے بہت کام نہ آئیں بلکہ عین ممکن ہے کہ اپنے خود کے مفادات کے حصول کے پیش نظر اس میں امریکہ کے خلاف ہی خلل انداز ہوں۔

سوم، ایران کے خلاف جنگ یقیناً امریکہ کے حق میں عراق جنگ سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوگی۔ امریکہ آج بھی ایران کی مکمل عسکری طاقت سے واقف نہیں ہے۔ طویل عرصے سے اسلحہ فروخت کرنے والے مغربی بازار سے علاحدہ کیے جانے کی وجہ سے ایران اپنی خود کی گھریلو اسلحہ ساز انڈسٹری قائم کرچکا ہے، جس کی قوت وصلاحیت سے بیرونی دنیا ہنوز ناواقف ہے۔ باوجود اس کے کہ ایران کی عسکری طاقت امریکہ کے مقابلہ میں کم تر ہے، تاہم ایران کی فوج صدام حسین کی فوج سے کہیں زیادہ مضبوط ہے جسے 2003 میں چند ہفتوں میں امریکی فوج نے مات دے دی تھی۔ ایرانی فوج کافی بہتر طور پر تیار ہے، نظریاتی طور پر زیادہ پرعزم ہے اور تعداد میں بھی زیادہ ہے۔ یہ عسکری قوت، ایران کے پہاڑی خطہ ارض کے ساتھ، کسی بھی غاصب فوج پر ایرانی فوج کے تفوق کی ضمانت دیتی ہے۔ افغانستان اور عراق میں ہزیمت کے بعد امریکہ کی جانب سے ایران پر مکمل زمینی حملہ کا امکان کم ہے اور اگر وہ ہوائی حملہ بھی کرتا ہے تو ایران خاموش تماشائی کا کردار نہیں ادا کرے گا۔ ایران اس قابل ہے کہ وہ اپنے سرحدی پڑوسی ممالک میں امریکی اڈوں کو نشانہ بنا سکے وہ تیل کی آمدورفت کے راستوں کو بھی متاثر کرسکتا ہے۔ جب کہ اس کے حلیف اور دوست ممالک اس قابل ہیں کہ امریکہ اور اس کے حلیف ممالک کے خلاف اسٹریٹجک مفادات کو بڑھاوا دے سکیں۔ امریکہ ایک ایسی جنگ چھیڑنے کا خطرہ مول لے رہا ہے جسے ختم کرنا اس کے بس میں نہیں ہوگا۔

اس طرح امریکہ اپنی ''زیادہ سے زیادہ دباؤ پالیسی'' کو جاری رکھنے یا جنگ چھیڑنے کے لیے چاہے جس بھی راستے کا انتخاب کرے، بالآخر اسے ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ جب ایران امریکہ کے ساتھ ڈپلومیسی ختم کرنے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایران متبادل حکمت ہائے عملی پر غور کررہا ہے اس کی علامات پہلے ہی سامنے آچکی ہیں۔ چند جماعتیں اب بھی موجود ہیں جو تہران اور واشنگٹن کے مابین ثالثی کی خواہاں ہیں۔ امید برقرار ہے کہ یہ جماعتیں جنگ کی طرف بڑھ رہی صورت حال کو قابو میں کرنے اور ایک ممکنہ جنگ کو باز رکھنے میں کامیاب ہوں گی۔ ایران اور امریکہ کے لیے اب بھی وقت ہے کہ وہ اپنے اختلاف پرامن طریقے سے حل کرلیں۔ (بشکریہ الجزیرہ)

HASSAN AHMADIAN
Postdoctoral Research Fellow
The Iran Project,
Harvard Kennedy School's Belfer Center

وہن کی بیماری

شمشاد حسین فلاحی

’وہن‘ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کمزور ہونا۔قرآن کریم میں یہ لفظ اسی معنی میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔سورۃ العنکبوت آیت 41 میں ہے:

’’ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتاً
وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ
لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ‘‘

ترجمہ’’جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ولی اور کارساز بتاتے ہیں ان کی مثال اس مکڑی کی سی ہے جو گھر بناتی ہے اور بلا شبہ سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے۔کاش کہ یہ لوگ سمجھتے۔‘‘

اسی طرح یہ لفظ سورۃ مریم آیت 4 میں بھی کمزوری کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔حضرت زکریا علیہ السلام بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گئے مگر ان کو کوئی اولاد نہیں ہوئی تو انھوں نے دعا کی کہ:

’’قَالَ
رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ
مِنِّي وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْباً
وَلَمْ أَكُن بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيّاً‘‘

ترجمہ:’’اور اس (زکریا) نے کہا کہ اے میرے رب (بڑھاپے کے سبب) میری ہڈیاں کمزوری سے بھربھری ہو چکی ہیں اور میرے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں! اور اے میرے رب (مجھے یقین ہے) کہ میں تجھے پکار کر بدبختی (اولاد سے محرومی) میں نہیں رہوں گا۔‘‘

قرآن کریم کے ان دونوں استعمال سے وہن کے لغوی معنی واضح ہیں لیکن حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لفظ کو مسلم معاشرے کی ذہنی وفکری کمزوری اور ایک خطرناک روحانی بیماری کے طور پر واضح کیا ہے۔اس بیماری کے اثرات اور نتائج بھی نہایت خطرناک، مہلک اور تباہ کن ہوتے ہیں اور اگر یہ بیماری کسی مومن کو لگ جائے تو اس کی دنیا اور آخرت تباہ ہو جاتی ہے اور اگر وہ کسی

گروہ کو اپنی گرفت میں لے لے تو پھر اس کے نتائج اور انجام کار کیا ہوتا ہے حضور پاک ﷺ نے اسے بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے ملاحظہ فرمائیں:

رسول پاک اپنے احباب کے ساتھ مجلس میں بیٹھے ہوئے ہیں اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہو رہی ہے۔ حضور پاک ﷺ فرماتے ہیں کہ اس امت پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ دوسری قومیں اس پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح بھوکے دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ صحابہ کرام جو معرکوں پر معرکے سر کرتے جاتے تھے اور اسلام اور مسلمانوں کا عروج اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ ایک آدمی پوچھ لیتا ہے کہ کیا اس وقت ہماری تعداد کم ہو جائے گی؟ رسول پاک ﷺ جواب دیتے ہیں نہیں! اس وقت تمہاری تعداد بہت زیادہ ہوگی مگر تم سیلاب کے جھاگ کے مانند ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہارا خوف نکال دے گا اور تمہارے اپنے دلوں میں 'وہن' بھر دے گا۔ ایک آدمی پوچھتا ہے کہ یا رسول اللہ یہ 'وہن' کیا ہے؟ آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا: حُبُّ الدُّنیا وَ کَرَاہِیَۃُ المَوتِ۔ وہن یہ ہے کہ انسان دنیا سے محبت کرنے لگے اور موت کو ناپسند کرنے لگے۔

حضور پاک ﷺ نے اس حدیث میں، جو ابوداؤد میں حضرت ثوبانؓ کے حوالے سے مذکور ہے، وہن کی وضاحت کرنے سے پہلے اس کے خطرناک اثرات کا ذکر کیا ہے جسے صحابہ کرامؓ کے ذہن و فکر قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ لیکن جب اس کی وجہ بیان کی تو سب خاموش اور مطمئن ہو گئے کہ دنیا کی محبت میں گرفتار ہو جانے والوں اور موت کو ناپسند کرنے والوں کا تو حشر یہی ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ اس 'وہن' کو ہم اپنی سادہ سی زبان میں 'بزدلی' کہہ سکتے ہیں۔ ایک بزدل انسان کے لیے موت کا تصور ہی خوفناک ہوتا ہے اور وہ اس کے خیال ہی سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے کیونکہ اسے موت سے نفرت اور زندگی سے محبت ہوتی ہے۔ اگر تھوڑا سا اور گہرائی میں جا کر دیکھیں اور سوچیں تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ کسی انسان کو موت سے اس قدر نفرت کیوں ہوتی ہے؟ غور کیجیے! سوچیے! صاف ہے کہ موت سے نفرت اس لیے ہوتی ہے کہ ہم جینا چاہتے ہیں اور جینا اس لیے چاہتے ہیں کہ دنیا میں جو سہولیات، آرام اور آسائشیں اور مال و دولت ہم نے جمع کیا ہے اسے برت سکیں اور اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ زندگی کا یہی لالچ ہمیں موت کو ناپسند کراتا ہے۔ بس یہ 'وہن' پھر ایک اخلاقی اور روحانی بیماری بن جاتا ہے اور فرد اور گروہ کو سیلاب کے ناکارہ جھاگ کے مانند بنا دیتی ہے۔ پھر جب دشمن اور مخالف کو ہماری ان کمزوریوں کا پتہ چل جاتا ہے تو وہ ہماری طاقت کے بھرم سے باہر آ جاتا ہے۔ پھر جب وہ حملہ آور ہوتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ ان سے ڈرتا رہا یہ تو بڑے بزدل اور کمزور لوگ ہیں۔

وہن ایک کمزوری ہے اور ہم نے اسے بزدلی کے الفاظ میں بیان کیا ہے جو اردو زبان میں حدیث کے الفاظ و واقعے کے مرکزی نقطہ کو بیان کرنے کے لیے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔ اب ذرا اس کے برعکس رویہ کو بھی دیکھ لیتے ہیں تاکہ معنی و مفہوم کے ساتھ ساتھ اس ذہنی و فکری اور روحانی بیماری کا علاج بھی معلوم ہو جائے۔ ایک تصویر دیکھئے یہ تصویر سیرت رسول کے البم سے لی گئی ہے اور 'وہن' کی برعکس کیفیت اور اس کے علاج کو بیان کرتی ہے۔

صحرائے عرب کی گرمی کا عالم ہے۔ ایک شخص اس صحرا میں ایک پیڑ کے نیچے آرام کرنے کے لیے آتا ہے اور اپنی تلوار درخت کی شاخ پر لٹکا کر ایک پتھر کو اپنے سر کے نیچے بہ طور تکیہ رکھ کر سو جاتا ہے۔ ایک دوسرا آدمی جو اس کا دشمن ہے ادھر سے گزرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ایک شخص پیڑ کے نیچے آرام کر رہا ہے۔ قریب آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو اس کا ناقابلِ شکست دشمن ہے۔ اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ گہری نیند سو رہا ہے کیونکہ اس کے قریب آ جانے کے باوجود اس سونے والے کی نیند نہیں ٹوٹی۔ تو پھر کیا ہے؟ انتظار کس لیے؟ کر دو اس کا کام تمام! نہ رہے بانس نہ بجے بانسری!

درخت سے لٹکی ہوئی تلوار اتار کر ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیتا ہے اور اسی تلوار کے ٹھوکے سے اس شخص کو جگاتا ہے۔ وہ سویا ہوا شخص بڑے اطمینان سے بیدار ہو کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ یہ تلوار بردار شخص اس شخص سے پوچھتا ہے بتا آج تجھے مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ وہ شخص بڑے اطمینان سے جواب دیتا ہے ''اللہ'' پھر کیا ہوا؟ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔ پتہ ہے یہ ''اللہ'' کہنے والا کون تھا؟ یہ حضور پاک محمد ﷺ تھے۔ پھر محمد رسول اللہ ﷺ اپنی تلوار زمین سے اٹھاتے ہیں اور اس شخص سے پوچھتے ہیں کہ اب تو بتا تجھے مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ وہ 'آپ' کہتا ہوا آپؐ کے قدموں میں گر جاتا ہے۔ یہ ہے وہن کا علاج!

SHAMSHAD HUSSAIN FALAHI
EDITOR HIJAB E ISLAMI
NEW DELHI
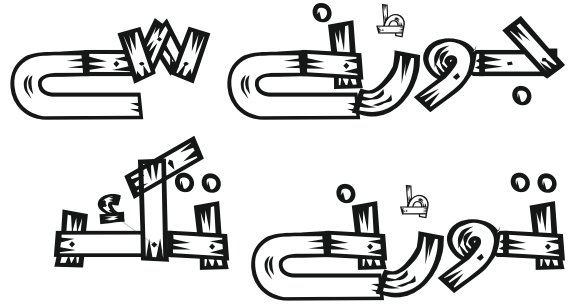
ستیش کھنگوال

بات بہت پرانی نہیں ہے۔ نوے کی دہائی میں معاشی اصلاحات جاری تھیں اور اسی دور میں ہمارے گھر میں ٹیلیفون لگا تھا۔ پاس پڑوس میں لڈو تقسیم کیے گئے تھے۔ گلی محلے کا پہلا ٹیلی فون تھا، اس لیے دو تین دن تک پڑوسیوں کا تانتا لگا رہا۔ ہماری بیٹھک کے ایک کونے میں براجمان ٹیلیفون کا نظارہ کرنے کے لیے لوگ آتے۔ جانے کے وقت ٹیلیفون نمبر لے جانا کوئی نہیں بھولتا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں لوگ یہ بھی کہہ جاتے کہ ''اگر ہمارا کوئی فون آجائے تو بلا لینا۔'' ان کی اس بات میں حکم، گزارش، محبت، دعا اور ہمدردی سب کچھ ہوتا تھا۔ ٹرن۔ٹرن۔ٹرن۔۔۔! اوہ! کتنی شیریں تھی وہ آواز ان دنوں۔ سنتے ہی دل خوش ہو اٹھتا تھا۔ گھر والوں کے ساتھ ساتھ پڑوسیوں کے کان بھی اس آواز کو سننے کے منتظر رہتے تھے۔ کمال کی بات یہ تھی کہ اپنے فون کم آتے تھے اور پڑوسیوں کے زیادہ۔ قریبی پڑوسیوں کو تو گھر سے ہی آواز دے کر بلا لیتے تھے۔ کسی کسی آشنا کو بلانے کے لیے ایک آدھ کلومیٹر کا سفر کرنا پڑ جاتا تھا۔ مگر کوئی حیل۔حجت نہیں۔ کوئی ناراضگی یا شکایت نہیں۔ جس شناسا کے لیے فون آتا تھا اسے بلانے کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔ سامنے والا بھی احسان مان کر ایسے دوڑا آتا تھا جیسے اگر وقت پر نہیں پہنچا تو ٹرین چھوٹ جائے گی۔ جو فون سننے آتے، انہیں عام طور پر چائے ناشتہ بھی دیا جاتا۔ لیکن نہ کبھی ابا جان کی جبین پر شکن دیکھی نہ کبھی اماں کے چہرے پر جھنجھلاہٹ۔

یہ صرف میرے گھر کی کہانی نہیں ہے۔ یہ نوے کی دہائی کے ہر اس گھر کی کہانی ہے، جس میں ٹیلیفون ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ٹیلیفون انسانی رشتوں کی نئی کہانی لکھ رہا تھا۔ اپنے تاروں سے دلوں کے تار جوڑ رہا تھا۔ اجنبیت کی دیواریں منہدم کر کے لوگوں کو قریب لا رہا تھا۔ حتیٰ کہ بالکل انجان آدمی، جو خراب ٹیلیفون کو درست کرنے آتا تھا، وہ بھی گھر ہی کے آدمی کی طرح ہو جاتا تھا۔ ٹیلیفون پر بات کرنا بہت مہنگا ہوتا تھا، مگر اس نے لوگوں کو آپس میں جوڑ دیا تھا۔ مہینوں میں پہنچنے والے خطوط کی جگہ خوشی وغم کی خبروں کو منٹوں پہنچانے میں ٹیلیفون نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ جب دور بیٹھے ماں باپ اپنے بچوں کی آوازیں سنتے تھے تو انہیں لگتا تھا کہ بچے ان کے سامنے ہی ہیں اور بچوں کو لگتا تھا کہ ماں باپ ان کے سر پر ہاتھ پھیر رہے ہیں۔

رفتہ رفتہ تکنالوجی میں ترقی آئی۔ ٹیلیفون کا نیا اوتار 'موبائل' آگیا۔ نئے زمانے کی یہ چھوٹی سی مشین گھر کے کسی گوشے کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے والی نہیں تھی۔ نہ اس سے کوئی تار ہی جڑا تھا۔ ایک چھوٹی سی چپ کے ذریعے کہیں بھی اور کبھی بھی اس کا استعمال بآسانی کیا جاسکتا تھا۔ بہت جلد موبائل کو قبول عام حاصل ہوگیا۔ بڑی کمپنیوں کے اس میدان میں کودنے اور ان کی باہمی مسابقت سے نہ صرف یہ کہ موبائل کے دام سستے ہوگئے بلکہ بات چیت کرنے اور پیغامات ارسال کرنے کی سہولت بھی سستی ہوگئی۔ ٹیلیفون کا نام اب 'لینڈ لائن' رکھ دیا گیا۔ عام لوگوں کی تو کیا بساط، خود تکنالوجی کے ماہرین کو پتہ نہیں چلا کہ 'مواصلاتی انقلاب' کب 'موبائل انقلاب' میں بدل گیا۔ آج موبائل محض بات چیت کرنے یا پیغامات بھیجنے کی مشین نہیں ہے، بلکہ اطلاعات کی نشرواشاعت کا سب سے کارآمد ذریعہ ہے۔ کسی بھی قسم کی اطلاع، بصری و سماعتی پیغامات، تصویر وغیرہ اس کے ذریعے فوری طور پر نشر ہوتی ہیں۔ عوامی بیداری میں بھی موبائل کا اہم کردار ہے۔ موبائل کی مدد سے مجرمین تک پکڑے جا رہے ہیں۔ ناانصافی، بدعنوانی، انتظامیہ کا ناکارہ پن وغیرہ مسائل کے خلاف عوام نے موبائل کے ذریعے ہی اپنی آواز بلند کی ہے۔ لیکن اس روشن پہلو کے ساتھ اس کا ایک تاریک پہلو بھی ہے۔ موبائل انسانی رشتوں میں دراڑ پیدا کرنے کا کام کر رہا ہے۔

آج کل سماجی، سیاسی اور مذہبی وغیرہ موضوعات سوشل میڈیا کا موضوع بن گئے ہیں۔ سوشل میڈیا کا سب سے بڑا ہتھیار موبائل ہی ہے۔ بھائی، دوست، رشتہ دار، شناسا، اجنبی سبھی آپس میں بحث وتکرار میں الجھ گئے ہیں۔ سب اپنی اپنی رائے اور نظریہ ایک دوسرے پر تھوپنے لگے ہیں۔ ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے۔ لوگ آناً فاناً میں اطلاعات نشر کرتے ہیں، یہ تحقیق کیے بغیر کہ وہ اطلاعات کتنی صحیح ہیں اور کتنی غلط اور یہ کہ غلط اطلاعات کے کیا اثرات پڑ سکتے ہیں۔ گھر میں جتنے لوگ ہیں، اس سے زیادہ موبائل ہیں۔ فرد حقیقی رشتوں کو نظر انداز کر کے نیم جعلی رشتوں کو مضبوط کرنے میں لگا ہوا ہے۔ موبائل اس دور کی سب سے ضروری اور کارآمد مشین ہے۔ اگر احتیاط سے اس کا استعمال کیا جائے تو یہ کسی تحفہ سے کم نہیں ہے۔ لیکن اگر اسی طرح اس کا استعمال ہوتا رہا تو یہ باہمی محبت و ہمدردی کو نگل لے گا۔ رشتوں کی مٹھاس ختم کر دے گا۔ آج جب موبائل کو رشتوں میں دوری پیدا کرتے دیکھتا ہوں تو بچپن کے لینڈ لائن کی یاد آجاتی ہے۔

عفان معین خان

کیا آپ جانتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالی نے انسان کی ہدایت کے لئے کیا انتظام فرمایا ہے؟ اس نے اپنے گمراہ بندوں کو صراطِ مستقیم دکھانے اور اس پر چلانے کے لیے کیا اہتمام کیا ہے؟ اس نے ظلم و جبر اور بھیانک گناہوں کے دلدل میں پھنسے انسانوں کو اس سے نکالنے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا ہے؟ اس نے شرک جیسے ظلمِ عظیم میں مست لوگوں کو توحید کا علمبر دار بنانے کے لیے کیا سامان کیا ہے؟ اس نے اس عظیم کائنات میں انسان کو کس مقصد سے پیدا کیا ہے؟

جس خدا نے اس کائنات کو ایک ترتیب کے ساتھ پیدا کیا، اس کو چاند ستاروں سے مزین کیا اور پھر اس میں انسان جیسی عظیم الشان مخلوق کو وجود بخشا بھلا وہ کیسے اس کی ہدایت کا سامان نہ کرتا؟

اس نے انسان کی ہدایت کا سامان بھی کیا اور اس کی زندگی کے مقصد سے اسے آگاہ بھی کیا۔ اس نے اپنے گمراہ بندوں کی ہدایت کے لیے خود انسانوں ہی میں سے صالح و برگزیدہ بندوں کا انتخاب کیا اور انہیں اپنی قوم و ملت کے لئے ایک بہترین نمونہ بنایا۔ ان اعلی نفوس کے ذریعے سے اس نے انسانیت تک اپنے دین کی تبلیغ کا کام لیا۔ یہ اللہ تبارک وتعالی کی سنت رہی ہے کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے مختلف زمانوں اور قوموں میں انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا تاکہ دین کو خالص کیا جائے اور ازسرِ نو لوگوں کی اصلاح کی جائے۔ انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی جائے اور ان کا تزکیہ کیا جائے۔ ظلمات میں بھٹکتی انسانیت کو نورِ توحید کے ذریعے صراطِ مستقیم کی طرف گامزن کیا جائے۔ انہیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر توحید کی روشنی میں چلایا جائے۔ ان کی اخلاقی اور فکری تربیت کی جائے اور ان کے عقیدے کو سدھارا جائے۔ معاشرے میں عدل و انصاف، امن و اخوت اور ہمدردی و بھائی چارگی کی اعلیٰ مثال قائم کی جائے۔ انسانوں کو انسانوں کی غلامی و حکمرانی سے نکال کر وحدہٗ لاشریک کی حکمرانی میں جینے کا طریقہ وسلیقہ سکھایا جائے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام کی یہی ذمہ داری تھی اور یہی ان کی بعثت کا مقصد تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا کلام و پیغام قرآن مجید کی شکل میں ہمارے درمیان اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ یہی ہمارا دستور ہے اور یہی ہمارے لیے قیامت تک ہدایت کا سرچشمہ بھی۔ اس سرچشمہ سے ہمیں سیراب ہو کر دنیا کے انسانوں کی پیاس بجھانی ہے اور ان کو سیراب کرنا ہے۔ چوں کہ انبیاء کی بعثت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اس لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین قرار پائے۔ انبیاء کی ذمہ داری اب ''امت مسلمہ'' پر یعنی ہم پر ہے کہ ہم اس فریضہ کو انجام دیں۔ ہم اپنے فرضِ منصبی کے تئیں حساس ہوں کہ یہ فرضِ عین ہے اور یہی انبیائی کام ہے۔ ہم گفتار کے غازی بھی ہوں اور کردار کے غازی بھی۔ ہمارے قول و عمل میں مماثلت ہو، تضاد نہ ہو۔ ہمارے دلوں میں انسانوں کے لئے ہمدردی ہو۔ جہاں ہم اپنی ذات کو اللہ کے غضب سے بچانے کی فکر کریں وہیں دنیا میں بسنے والے انسانوں کے لئے بھی ہم یہ کوشش کریں کہ وہ بھی اللہ کے غضب سے بچ جائیں اور اس کی خوشنودی کی راہ پر گامزن ہوں۔ قرآن مجید کو جہاں ہم اپنی زندگیوں میں نافذ کریں وہیں ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہم اس کے پیغام کو دنیا کے انسانوں پر بھی واضح کر دیں۔ یہی عظیم کام ہے اور اس کام کو انجام دینے والا شخص ہی عظیم انسان ہے۔

اللہ تبارک وتعالی ہمیں اس عظیم کلام و پیغام کو سمجھنے اس کو اپنی زندگیوں میں نافذ کرنے اور اسے عوام الناس تک کما حقہ پہنچانے والا بنائے۔ آمین

تدبیر اور اقدام بھی ضروری

ذوالقرنین

ملک کے حالات سے آج ہر کوئی کسی نہ کسی حد تک واقف ہے۔ کیونکہ یہ سوشل میڈیا کا دور ہے۔ پل بھر میں یا کچھ سیکنڈ میں ہزاروں میل کی خبریں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتی ہیں۔ 2014 میں بی جے پی کے اقتدار میں آنے کے بعد سے ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف سرگرمیاں تیز تر ہو گئی ہیں۔ اسلام کی مخالفت یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر زمانے میں اسلام کو چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قریش مکہ کو کوہ صفا سے خطاب فرمایا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو کیا تم میری بات کا یقین کر لو گے؟ قریش مکہ نے کہا کہ جی ہاں ہم یقین کر لیں گے کیوں کہ آپ صادق و امین ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو سمجھانے کے لیے مثال تھی۔ اس کے بعد پہلی مرتبہ رسول اللہ نے اپنی نبوت اور اسلام کی دعوت کا اعلان کیا۔ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی دعوت پیش کی تو سب سے پہلے آپ کے چچا ابولہب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا انکار کیا، کہا کیا ہمیں اسی لیے یہاں جمع کیا تھا؟ اور برا بھلا کہنے لگا۔

قریش مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہو گئے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمت و استقامت شجاعت و بہادری سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام جاری رکھا۔ مختصر مدت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانیوں سے صحابہ کرام کی جماعت تیار ہو گئی اور عرب میں تیزی سے اسلام پھیل گیا۔ عرب کے باہر بھی جو مسلمان تجارت کی غرض سے جاتے تھے ان کے اخلاق و کردار، ایمانداری و دیانت داری کو دیکھ کر لوگ اسلام قبول کرنے لگے۔ آج کلمہ لا الہ الا اللہ کا پڑھنے والا دنیا کے ہر خطہ میں موجود ہے۔ دنیا کے 57 ملکوں میں مسلم حکومت قائم ہے لیکن پھر بھی ہر طرف سے مسلمان کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اکثر مسلم ریاستیں محض نام کی مسلم ریاستیں ہیں۔ ان کے کردار و عمل اور ملک کا نظام حکومت اسلامی نہیں ہے۔

ہم ہندوستان کے ہی حالات پر نظر ڈالیں تو اتنی بڑی تعداد میں مسلمان ہونے کے باوجود وہ فرقوں، جماعتوں اور مسلکوں میں منقسم ہیں۔ آج کا باطل اسلام و مسلمانوں کو للکار رہا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی دینی غیرت و حمیت انہیں نہیں للکار رہی ہیں۔ کیونکہ ایمان کی حلاوت دلوں میں نہیں رہی۔ ایمان کی حلاوت کیسے رہے گی جب بلا سوچے سمجھے حرام مال کا استعمال عام ہو جائے، سود کا لین دین عام ہو جائے! یہی نہیں ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو بلا سوچے سمجھے اندھی تقلید میں گرفتار ہیں۔ میری مسجد، میرا امام، میرا مسلک، میرا فرقہ، میری جماعت، میرا لٹریچر ہی صحیح ہے اور باقی سب سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے! کچھ جماعتیں اپنی جماعت کی اشاعت میں لگی ہوئی ہیں۔ بس تعداد جمع کرنا ان کا مقصد رہ گیا ہے۔ لیکن وقتی طور پر عوام کا جم غفیر جمع کر لینا کافی نہیں ہیں۔ افراد کی ہمہ جہت تربیت پر توجہ دی جانی چاہیے۔ ان کے دل ایمان کی حلاوت سے آشنا ہونے چاہئیں کہ تا کہ وہ محض موسمی مسلمان کا کردار ادا نہ کریں۔ اس وقت ضرورت ایسے افراد کی ہے جو ایمان پر ہر حال میں جمے رہیں۔ چاہے انہیں تختہ دار پر لٹکایا جائے یا آگ میں جلا دیا جائے، لیکن ان کے ایمان میں تزلزل نہ آنے پائے۔ باطل طاقتوں کے خلاف ہمیں ایسے افراد کی تربیت کرنے کی ضرورت ہے جو ہر محاذ پر کام کرنے والے ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح صحابہ کرام کو تیار کیا تھا۔ ایمانی قوت کے ساتھ ساتھ وہ مقدس جماعت میدان جنگ میں بھی ماہر تھی۔ وہ جماعت تجارت کے میدان میں بھی آگے تھی۔ وہ آنے والے حالات کو بھانپ لینے کی بصیرت رکھتی تھی۔ وہ حالات کے آنے سے قبل حالات پر قابو پانے کے لیے جدوجہد کا ہنر جانتی تھی۔ وہ دعاؤں پر کامل یقین کے ساتھ ساتھ اسباب وسائل بھی اختیار کرتی تھی۔

خوف اور دہشت میں پلی ایک لڑکی کی کہانی

پیش کش: نجم السحر

’میں صحافی اس لئے بننا چاہتی ہوں تا کہ میں اپنے لوگوں کی کہانیاں دنیا کو سنا سکوں۔ میں کبھی ہار ماننے والی نہیں ہوں۔ میں ہمیشہ سچ کے ساتھ ڈٹ کر کھڑی رہوں گی۔‘

یہ کہانی ہے پاکستان کے بلوچستان ضلع کے ایک آدیباسی گاؤں میں پلی بڑھی نعیمہ زہری کی۔ بلوچستان پاکستان کے غریب ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ اس شہر نے علاحدگی پسندوں اور پاکستانی فوجیوں کے مابین لمبے عرصے سے چلی آ رہی دشمنی کو برداشت کیا ہے۔ یہاں دور دراز کے پہاڑی علاقوں میں زندگی گزارنا مشکل ہے۔

یہ کہانی ایک ایسی لڑکی کی ہے جو اس گاؤں میں پلی بڑھی جہاں ہر طرف خوف اور ہتھیار تھے۔ اس کا بچپن عام بچوں کی طرح نہیں تھا۔ سات بھائی بہن، اکیلی کمزور ماں، باپ کا بیوی بچوں کو چھوڑ کسی دوسری عورت سے شادی کر لینا۔ انتہائی غریبی اور درد میں گزرا ہے اس کا بچپن۔ نعیمہ کی ماں وہاں کی عام عورتوں اور لڑکیوں کی طرح بے چاری ان پڑھ تھی۔ گاؤں میں بڑھتی دہشت گردی میں اس کے چچا اپنی جانیں گنوا چکے تھے۔ ایک دن اچانک انہیں غائب کر دیا گیا تھا اور کچھ مہینوں کے بعد گولیوں سے چھلنی ان کی لاش ملی تھی۔ گاؤں میں کچھ سالوں تک ہتھیار بند لوگوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ انہوں نے لڑکیوں کے اسکول کو گھیرے رکھا تھا۔ ان کے مقصد دو تھے۔ ایک، لڑکیوں کو پڑھائی سے دور رکھنا اور، اور دوسرا اسکول کو دہشت گردی کے مقاصد کے لیے اپنے ٹھکانے کے طور پر استعمال کرنا۔ اسکول کے سامنے چھ سے آٹھ لوگ ہمیشہ کھڑے رہتے تھے۔ جن کے چہرے نقاب سے ڈھکے رہتے۔ گاؤں والوں پر ان خوفناک چہروں کا بہت گہرا اثر تھا۔ ایسے ماحول میں سرکاری ٹیچرس کام کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ 2009 سے 2013 تک اسکول کو کچھ مقامی مجرمین نے اپنے قبضے میں لے رکھا تھا۔ انہیں قبائلی علاقوں کے افسروں کا ساتھ حاصل تھا۔ لڑکیاں اسکول نہ جا سکیں اس کے لیے وہ مین گیٹ پر پہرا دیتے تھے۔ گاؤں میں ایسے کئی اسکول تھے جو صرف کاغذوں پر موجود تھے۔ کئی اسکولوں میں اساتذہ کی تقرری بھی کی گئی تھی اور وہ حکومت سے تنخواہ بھی لیتے تھے۔ لیکن اسکولوں کی حالت پوری طرح سے خراب تھی۔ عورتوں کے ساتھ مساوات کا عجیب حال تھا۔ انہیں پڑھائی کے لئے تو روکا جاتا لیکن جب کھیتوں میں مردوں کے ساتھ کام کرنے کی بات آتی تو وہاں کوئی پابندی نہیں تھی۔ گھر پر رہنے والی عورتیں سلائی کر کے پیسے کمایا کرتی تھیں۔ لیکن ان کی کمائی کو خرچ کرنے کا حق صرف مردوں کے پاس ہی ہوتا تھا۔ ایسے ماحول میں پڑھائی کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ ان ہی لڑکیوں میں ایک لڑکی نعیمہ تھی۔ جس نے دس سال کی عمر تک گاؤں کے سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اس اسکول کو بند کر دیا گیا۔ اسکول بند ہونے کے بعد گاؤں کے قریب ایک اسکول میں اس کا داخلہ تو ہو گیا لیکن وہاں صرف داخلہ ہوتا تھا، پڑھائی نہیں۔ گھر والے نعیمہ کو پڑھنے کے لئے وہاں نہیں بھیجتے تھے بلکہ مفت میں ملنے والے کھانا بنانے کے تیل کے لئے بھیجتے تھے۔ گاؤں میں بڑھتی دہشت گردی اور رشتہ داروں کی موت کے بعد انٹر کی پڑھائی کے بعد اس کا اسکول جانا روک دیا گیا۔ البتہ گاؤں والوں کے دباؤ اور گھر کی مالی حالت خستہ ہونے کے باوجود اس نے اپنی پڑھائی کے لئے گھر والوں کو راضی کر لیا۔ لیکن بھائیوں نے ذمہ داری لینے سے صاف انکار کر دیا۔ نعیمہ نے قریب کے گاؤں کے ایک کالج میں داخلہ لے لیا۔ جس کی ایک سال کی فیس اس کے ایک چچا نے ادا کر دی۔ اس طرح اس نے اپنا سفر پوری بہادری اور عزم کے ساتھ جاری رکھا۔

نعیمہ نے اسی سال اپنی پڑھائی مکمل کی ہے اور اب وہ صحافت کی تربیت حاصل کر رہی ہے۔ اس نے اپنی کہانی بی بی سی کی نمائندہ شمائلہ جعفری کو سنائی ہے۔

بہت دلچسپ

پیارے بچو! ہم آپ کے لیے لے کر آئے ہیں ایسی دلچسپ باتیں جو آپ کو حیران بھی کریں گی اور تھوڑا سا پریشان بھی! آپ سوچیں گے اور کئی بار سوچیں گے۔ تو سنیے!

- ایک انسانی دماغ ہر سیکنڈ 38 ہزار ٹرلین سے بھی زیادہ کام سرانجام دیتا ہے۔ جبکہ آج تک کا سب سے طاقتور کمپیوٹر جس کا نام بلوجین ''Blue Gene'' ہے انسانی دماغ کا صرف 0.002% کام ہی انجام دے سکتا ہے۔
- ایک 4 سال کا بچہ دن بھر میں اوسطاً 400 سوال پوچھتا ہے۔
- آپ کی پسندیدہ جگہ یوٹیوب پر موجود ہر ایک ویڈیو کو اگر آپ دیکھنا چاہیں تو اس کیلئے آپ کو تقریباً 1000 سال کا وقت درکار ہوگا۔
- آپ خواب دیکھتے ہوئے خراٹے نہیں لے سکتے اور خراٹے لیتے ہوئے خواب نہیں دیکھ سکتے۔ یعنی آپ یہ دونوں کام ایک ساتھ نہیں کر سکتے۔
- ایک خراب گھڑی دن میں 2 مرتبہ صحیح وقت بتاتی ہے۔
- ہماری آنکھیں پیدائش سے لے کر مرنے تک ایک ہی سائز کی رہتی ہیں، جب کہ ہمارے کان اور ناک زندگی بھر بڑھتے ہیں۔
- اگر آپ 1 روپے سے کاروبار شروع کریں اور روزانہ اپنے پیسوں کو دوگنا کریں تو آپ 27 دنوں میں کڑوڑپتی بن جائیں گے۔
- جو مہینہ اتوار سے شروع ہوتا ہے، اس مہینے کی 13 تاریخ کو جمعہ ہوتا ہے۔

خبر

ENVIRONMENTAL ACTIVISM ORIENTATION WORKSHOP

13-14 JULY | JAIPUR | RAJASTHAN

ماحولیاتی سرگرمی ورکشاپ کا انعقاد

گزشتہ 13 اور 14 جولائی 2019 کو اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن (SIO) آف انڈیا اور سینٹر فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (CERT) کی جانب سے جے پور میں دو روزہ ماحولیاتی سرگرمی رہنمائی ورکشاپ (Environmental Activism Orientation Workshop) منعقد کیا گیا۔ ماحولیاتی سرگرمی پر تحقیق کرنے والے اور اس میدان میں دلچسپی رکھنے والے ملک کی مختلف ریاستوں کے مندوبین نے اس ورکشاپ سے استفادہ کیا۔ قارئین رفیق کی خدمت میں پیش ہیں اس اہم ورکشاپ کی چند تصویری جھلکیاں۔۔۔ (ادارہ)